

لاش، لڑکی اور گف کے کنہرگار

جرم و سزا اور سراغ رسانی کی ایک انوکھی اور حقیقی کہانی

احمد یار خان



پیش لفظ

جناب احمد یار خان کی ایک مکمل کہانی پیش کی جا رہی ہے۔ یہ کہانی ”حکایت“ میں دو قسطوں میں شائع کی گئی تھی۔ یہ اتنی طویل تھی کہ چار قسطوں پر پھیل گئی تھی۔ ہم ”حکایت“ کے قارئین کو اتنے زیادہ انتظار کی زحمت دینا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ ہم نے اس کا علاج یہ سوچا کہ کتنے تفصیلات حذف کر کے کہانی دو قسطوں میں سدا دی۔ اب ہم ان تفصیلات کے ساتھ جو حذف کر دی گئی تھیں، مکمل کہانی پیش کر رہے ہیں۔

جناب احمد یار خان کی ہر کہانی کی طرح اس کہانی میں بھی کئی رنگ ملتے ہیں لیکن تفتیشی کہانی جو سچی ہے، مصنف کی دوسری تمام کہانیوں سے مختلف ہے۔ اس میں بعض واقعات ناقابل یقین لگتے ہیں، مثلاً ایک کنواری اور نوجوان لڑکی کو کالے جادو کے ذریعے گھر سے نکلوا دیا گیا۔ اس واقعہ کو افسانہ نہ سمجھیں۔ کالے علم کے ماہرین کے لیے یہ کام مشکل نہیں۔ جو لوگ کالے علم سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اس علم کا کوئی استاد ٹیلی میٹھی کے ذریعے دور بیٹھے ہوئے اور نظروں سے اوجھل انسان کو اپنے اثر میں لے سکتا ہے اور اس سے اپنی مرضی کی حرکتیں کر سکتا ہے۔

اس کہانی میں آپ دیکھیں گے کہ اللہ کا کلام کالے علم کو کس طرح پرکھا کرتا ہے۔ یہ بھی دیکھیں کہ کالے علم کے ذریعے شیطانی کام کر کے عامل پر کیا گزرتی ہے۔ اس علم کے ماہرین کسی کو اس علم کی زد میں لا کر اپنی حفاظت کا انتظام بھی کر لیتے ہیں۔ اگر عمل کرنے والا انارڈی ہو تو اس کا جو حال ہوتا ہے وہ اس کہانی میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ ردِ عمل نفسیاتی ہوتا ہے اور اسے آپ خدا کی بے آواز لائے بھی کہہ سکتے ہیں۔

گاؤں خاصا بڑا تھا۔ جس تھانے میں یہ گاؤں تھا اُس کا چارج کئے
مجھے ابھی چھٹا یا ساتواں روز تھا۔ جانے والے سب انسپکٹر نے مجھے علاقہ
گھوما پھر کر دکھا دیا تھا پھر بھی میں ابھی وہاں اجنبی تھا۔ مجھے چارج دے کر
جانے والا سب انسپکٹر ناگپور کے قریب کار سٹھنے والا پبل و اس نام کا
ہندو تھا۔

میں نے چارج لے کر اور علاقہ دیکھ کر وہ کیس دیکھے جو زیرِ تفتیش
تھے۔ اُس زمانے میں جرائم اتنے زیادہ نہیں ہوتے تھے جتنے آج کل ہو
رہے ہیں۔ میں ان کیسوں کا سرسری جائزہ لے رہا تھا۔ ان میں تین چار
کیس قتل کے بھی تھے۔ میری نظریں قتل کے ایک کیس پر رُک گئیں میرے
چارج لینے سے پانچ چھ روز پہلے کی تاریخ تھی۔ انیس بیس برس عمر کی ایک
غیر شادی شدہ مسلمان لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ درج تھی۔ تیسرے یا
چوتھے روز (کیس کی فائل کے مطابق) لڑکی کی لاش ملی۔ لڑکی کے والدین
نے اور گاؤں کے تین آدمیوں نے جن میں ایک منبر دار تھا، لاش کی
شناخت کی کہ یہ گمشدہ لڑکی کی لاش ہے۔ اس کے بعد سب انسپکٹر پبل و اس
نے نامعلوم قاتل کے خلاف مقدمہ درج کیا اور ایف۔ آئی۔ آر کا بھی تیسرے
روز میں چارج لینے لگیا۔ ان تین دنوں میں لاش کے پوسٹ مارٹم کے سوا
کوئی اور تفتیش نہیں ہوتی تھی۔

میں نے قتل کے اس کیس میں خاص چیز جو دیکھی وہ پوسٹ مارٹم
رپورٹ تھی۔ لاش کی حالت یہ کہ لاش ناقابلِ شناخت تھی چہرہ گیدڑوں
وغیرہ نے کھا لیا تھا۔ جسم کا کہیں کہیں گوشت رہ گیا تھا۔ پیٹ اور سینے کے
اندرونی اعضا کھاتے جا چکے تھے۔ ٹانگیں اور بازو ویسے ہی لاش کے ساتھ
تھے۔ یہ الگ ہو چکے تھے۔ ہڈیاں نظر آرہی تھیں۔ سر کے بالوں سے پتہ چلتا
تھا کہ یہ عورت کی لاش ہے۔ یہ پتہ چلانا ناممکن تھا کہ قتل سے پہلے اس

اس کہانی میں آپ کو غیرت مندی اور بے غیرتی ساتھ ساتھ چلتی نظر آئیں
گی۔ انسانی فطرت اور کردار کی بلندی اولپتی بھی نظر آئے گی۔ اہم سبق تو یہ ملتا
ہے کہ مجرم سات پردوں کے پیچھے کر دیکھ بھی پر دے اُٹھ جاتے اور مجرم کو
قانون کے سامنے کھڑا کر دیتے ہیں۔ مجرم کو چھپایا نہیں جاسکتا۔

انسانوں کے بناتے ہوئے قانون کے علاوہ ایک قانون اور بھی ہے۔
یہ قانون اُس ذاتِ باری تعالیٰ نے بنایا ہے جس نے انسان بناتے ہیں اور
انسان میں ضمیر رکھ دیا ہے۔ دنیا کے قانون سے مجرم بچ سکتا ہے، اللہ
کے قانون سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ رُو دیا بد مجرم کو سزا ضرور ملتی ہے۔ اس
کہانی میں آپ کو ایسے دو کردار ملیں گے جو دنیا کے قانون کی گرفت میں
نہیں آ سکتے تھے لیکن اللہ کی بے آواز لالچلی سے وہ نہ بچ سکے۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ ”حکایت“ لاہور

عورت کے ساتھ کیا سلوک ہوا تھا۔ پیٹ کے اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ معلوم کرنا بھی ممکن نہ تھا کہ اسے کس طریقے سے مارا گیا ہے اور یہ بھی معلوم نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اسے مرے کتنا وقت گزر چکا ہے۔

ایسی لاش کو شناخت کس طرح کیا گیا؟

مقتولہ کی ماں نے اور اُس کے باپ نے تحریری بیان دیتے تھے کہ انہوں نے کپڑوں سے اپنی بیٹی کی لاش پہچانی۔ دوسرے گواہوں نے بھی ایسے ہی بیان دیتے تھے۔

میں نے سب کے بیان پڑھے تو ان میں زیادہ تر فقرے ایک جیسے تھے۔ اس سے مجھے کچھ شک ہوا۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے پوچھا کہ اُس نے لاش دیکھی ہوگی، کیا وہ قابل شناخت تھی؟

”ہاں جی ہاں!“ اُس نے وثوق سے کہا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کس طرح لکھی جاتی ہے۔ مقتولہ کے لواحقین نے لاش کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔“

”نارائن جی!“ میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا۔ ”ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے انہی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دوستوں کی طرح ایک دوسرے کو اچھے رنگ روپ میں پہچانیں۔ سب انسپکٹر ہیل داس نے میرے آگے منہاری بہت تعریف کی تھی۔ اتنی زیادہ کہ مجھے ہنسا رہا تھا۔“

میں نے اب کے اتنے وثوق سے تو بات نہ کی لیکن پہلے جو جواب دے چکا تھا، اسی پر قائم رہا۔ میں نے بات یہیں پر ختم کر دی لیکن اس اے۔ ایس۔ آئی نے مجھے مزید شک میں ڈال دیا۔

مجھے یہ دھڑکا ہر وقت لگا رہتا تھا کہ میں مسلمان ہوں اور میں ہندوستان کے اُس علاقے میں لوہری کر رہا ہوں جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور انگریزوں کے ساتھ میں ہندو حکومت کر رہے ہیں۔

اُنچے عہدوں پر بھی ہندو افسر موجود تھے۔ اپنی دیانتداری کے علاوہ مجھے محتاط ہونا پڑتا تھا کہ کوئی ہندو ڈنک نہ مار جائے۔ ایسا ایک کیس میرے ذمے آگیا تھا جس کی تفتیش ہوتی ہی نہیں تھی۔ اس میں کوتاہی مجھے نقصان دے سکتی تھی۔ پہلا تھانیدار تو ایک ناقابل شناخت لاش کو گمشدہ لڑکی کی لاش ثابت کر کے چلا گیا تھا۔ اب مجھے قاتل کو پکڑنا تھا مگر شناخت پر مجھے شک ہو گیا۔

شام کو میں نے ایک ہیڈ کانٹیل کو پاس بٹھالیا اور اُس سے پوچھا کہ اُس نے وہ لاش دیکھی تھی؟

”برآمدگی کے وقت میں موجود تھا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”آپ اے۔ ایس۔ آئی صاحب کو پتہ نہ چلے دینا کہ میں نے آپ کو کچھ بتایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ لاش شناخت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ سر کے بالوں کے سوا کوئی اور نشانی نہیں تھی جس سے پہچاننا کہ یہ عورت ہے۔ جسم کا کوئی اور حصہ محفوظ نہیں تھا۔ سب انسپکٹر ہیل داس نے لڑکی کے باپ کو ڈراہم کارک منوایا کہ وہ کہے کہ یہ اُس کی بیٹی کی لاش ہے۔ گمشدہ لڑکی کی ماں سے بھی لکھے ہوئے بیان پر انگوٹھا گنوا گیا تھا۔ باقی تین گواہ اپنے ہی آدمی تھے۔ ان میں نمبر وار بھی تھا۔“

”ہیل داس نے اس کارروائی میں کیا فائدہ دیکھا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”گنتا تھا کہ اس طرح گمشدگی کی تفتیش ختم ہو جائے گی۔“ ہیڈ کانٹیل نے جواب دیا۔ ”تقل کی تفتیش ہوتی رہے گی۔۔۔ جناب! مجھے شک ہے کہ سب انسپکٹر ہیل داس نے کسی سے مال کھایا ہے۔“

”اے۔ ایس۔ آئی نارائن کو معلوم ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

میں آپ کو یہ بتا دوں کہ اس ہندو ہیڈ کانٹیل کو میرے ساتھ کیا ہمدردی تھی۔ یہ محض خوشامد تھی۔ غوث مدبٹر اقدیم فن ہے۔ اس ہندو کانٹیل نے سب انسپکٹر ہیل داس کو جب اُس نے اس محلے کا چارج لیا تھا، پہلے

بلایا۔ لاپتہ لڑکی کا نام شکوری لکھا تھا۔ وہ آگے تو دستور کے مطابق مجھے ان سے الگ الگ بیان لینے تھے لیکن میں نے دونوں کو اکٹھے ہی اپنے دفتر میں بٹھالیا۔

دونوں کی ذہنی حالت اچھی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اچھی ہونی بھی نہیں چاہیے تھی۔ ان کی جوان بیٹی قتل ہو گئی تھی۔ غم کے علاوہ میں نے ان کے چہروں پر اور ان کی حرکتوں میں خوف دیکھا۔ میں بات کرتا تھا تو دونوں چونک اٹھتے تھے۔ میں نے یہ اپنے ذہن میں رکھا ہوا تھا کہ ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے بتایا تھا کہ ان دونوں کو پہلے تھانیدار نے ڈرا دھمکا کر منوایا تھا کہ جولاں برآمد ہوتی ہے یہ ان کی بیٹی کی ہے۔

”کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کی بیٹی قتل ہو گئی ہے؟“ میں نے ان سے پوچھا۔

”ہاں حضور!“ باپ نے زور پر غلاموں کے سے بچے میں بڑی تیز تر لبو لہتے ہوئے کہا۔ ”میں بیان دے چکا ہوں۔ پہلے تھانیدار صاحب کو ہم دونوں نے بیان دے دیتے تھے۔ آپ کا حکم ہو تو پھر وہی بیان دے دیں گے“

”معلوم نہیں خدا ہمیں کون سے گناہ کی سزا دے رہا ہے“ شکوری کی ماں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور اس کے آنسو بہہ نکلے۔ شکوری کا باپ پڑھا لکھا اور معزز آدمی تھا۔ اسے ریلوے سے ریٹائر ہوئے ابھی تین ہی مہینے ہوئے تھے۔

”اگر میں آپ سے کہوں کہ آپ کی بیٹی قتل نہیں ہوئی اور وہ لاش آپ کی بیٹی کی نہیں تھی تو آپ کیا کہیں گے؟“ میں نے پوچھا۔ ”آپ جو کہیں گے ہم اسی کو صحیح مانیں گے“۔ باپ نے جواب دیا۔ ”میں یہ عرض ضرور کروں گا کہ یہ سلسلہ کہیں رگ جانا چاہیے۔ ہم دونوں نے دل پر پتھر رکھ کر مان لیا ہے کہ ہماری بیٹی قتل ہو گئی ہے“ ”کیوں مان لیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

تھانیدار کے خلاف باتیں سناتی ہوں گی اور اُسے خوش کیا ہوگا۔ اب وہ مجھے بھل داس کے راز دے رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے جانے کے بعد وہ اگلے تھانیدار کو میرے خلاف کچھ نہ کچھ بتائے گا لیکن مجھے اپنے کام کے راز لینے تھے جو وہ دے رہا تھا۔ خوشامد کی کسی کے یار نہیں ہوتے۔ انہیں اپنی ترقی اور دیگر فائدے کے لئے اپنے امیروں کو خوش رکھنا پڑتا ہے۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا“۔ ہیڈ کانسٹیبل نے جواب دیا۔ ”یہ بھل داس کا اپنا آدمی تھا۔ کوئی گڑبڑ کرنی ہوتی تو دونوں مل کر کرتے تھے“

اتنی سی بات ہی میرے لئے کافی تھی۔ مجھے تصدیق کی ضرورت تھی کہ لاش کی شناخت نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی نارائن سے کچھ نہ کہا۔ میں اُسے اس شک میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا کہ کسی نے میرے آگے اُس کی جھٹی کی ہے۔ اس ہیڈ کانسٹیبل نے جو ہندو تھا، مجھے یہ بھی بتایا کہ گمشدہ لڑکی کے متعلق ہر کسی نے یہی کہا تھا کہ شریف لڑکی ہے اور اس کا باپ تو بہت ہی نیک اور سچلا آدمی ہے۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ سے تفتیش شروع کر دوں گا میں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ لڑکی قتل نہیں ہوئی۔ اگر یہ کیس عدم پتہ قرار دے کر داخل دفتر کر دیا گیا ہوتا تو میں پر واہ ہی نہ کرتا۔ یہ کیس نہ تفتیش تھا اور کوئی تفتیش نہیں ہوتی تھی۔ یہ تو پچھانسی کا پھندہ تھا جو میرے نگلے میں آ پڑا تھا میں اس لئے بھی اس کیس کے پیچھے پڑ گیا کہ ہیڈ کانسٹیبل نے بتایا تھا کہ پہلے تھانیدار نے مال کھایا تھا۔

نگلی گالیاں یہ ہودہ باتیں

سب سے پہلے لاپتہ لڑکی کے باپ کو اور اُس کی ماں کو تھانے

”پہلے تھانیدار صاحب نے کہا تھا کہ مان لو۔“ باپ نے

جواب دیا۔

”اگر میں کہوں کہ مت مانو تو پھر؟“

”میں عرض کر چکا ہوں کہ پہلے اُن کی مافی ہمتی اب آپ کی مان لیں گے“

— باپ نے کہا۔ ”مجھ میں اب اور زیادہ دھمکیاں اور گالیاں برداشت کرنے کی ہمت نہیں۔“

”کیا یہ صحیح ہے کہ پہلے تھانیدار نے آپ کو ڈرا دھمکا کر لاش کی شناخت کرائی تھی؟“

”میں کسی تھانیدار کے خلاف بات زبان پر نہیں لاؤں گا۔“

باپ نے ڈر سے ہوتے لہجے میں کہا۔

”محترم ا!“ میں نے کہا۔ ”میری زبان سے نہ آپ دھمکی سنیں

گے نہ بدتمیزی کا کوئی لفظ۔ آپ گالیوں کی بات کرتے ہیں۔“ میں نے

اُس کی طرف ذرا جھک کر کہا۔ ”میں مسلمان ہوں۔ میں ہر اُس مسلمان

کی عزت کو اپنی عزت سمجھتا ہوں جسے اپنی عزت کا پاس ہے۔ پہلا تھانیدار

ہندو تھا۔ اُس نے شاید اس لئے آپ کی بیٹی کی گمشدگی کا کیس دوبارہ کھاتھا

کہ آپ مسلمان ہیں۔ اگر میں بھی اُس جیسا ہوتا تو مجھے یہ کیس باہر نکالنے کی

کیا ضرورت تھی؟ ... مجھے گناہ گار نہ کریں۔ مجھ پر شک نہ کریں۔“

ہمدردی کی اتنی سی بات سے اس معزز آدمی کے آنسو نکل آتے،

پھر وہ ایسا بے قابو ہوا کہ اُس نے رومال اپنی آنکھوں پر رکھ لیا اور سیکیاں

لینے لگا۔ اُس کی بیوی کی حالت اُس سے زیادہ بُری ہو گئی۔ میں تو اپنا

فرق ادا کر رہا تھا لیکن ان دونوں کے ساتھ مجھے ہمدردی ہو گئی۔ ایک تو

ان کی بیٹی لاپتہ ہو گئی اور اس پر ظلم یہ کہ تھانے میں ان کے ساتھ نہ جانے

کیسا برا سلوک ہوا تھا۔ میں نے خاصی مشکل سے ان دونوں کو یقین دلایا کہ

میں اُن کی عزت کروں گا اور گہرائی میں جا کر تفتیش کروں گا۔

”آپ کس بنا پر کہتے ہیں کہ ہماری بیٹی قتل نہیں ہوئی؟“ شکوری

کی ماں نے پوچھا۔

”مجھے شک ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں اپنا شک رفع

کرنے یا اسے صحیح ثابت کرنے کے لئے زمین کے نیچے بھی اتر جاؤں گا لیکن

مجھے آپ کے تعاون اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔ ... مجھے یہ بتائیں کہ لاش کی

لاپتہ کس طرح ہوئی؟“

”میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ میری بیٹی گھر سے کس طرح گئی ہے۔“

شکوری کے باپ نے کہا۔ ”میں اُس کا باپ ہوں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ

میری بیٹی ایسی نہیں تھی کہ کسی کے ساتھ گھر سے چلی جاتی۔ آپ گاؤں میں

جا کر میرے گھر اور میری بیٹی کے متعلق پوچھیں۔“

”پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ پہلے تھانیدار نے آپ سے لاش کی

شناخت کس طرح کرائی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

اُس نے بتایا کہ سب انسپکٹر پبل داس نے اُسے اور اُس کی

بیوی کو تھانے بلا کر ایک لاش دکھائی جس کے سر کے بال عورتوں جیسے

تھے۔ چہرہ کھایا ہوا تھا۔ گردن پر کھال اور گوشت تھا لیکن سینے کی تمام

پسلیاں بالکل ننگی تھیں۔ پیٹ بھی صاف تھا۔ اس کے اندر کچھ نہیں تھا۔

ٹانگوں سے گوشت نوجا ہوا تھا۔ پبل داس نے شکوری کے باپ اور اُس

کی ماں سے کہا کہ یہ ان کی لاپتہ بیٹی کی لاش ہے۔ باپ نے کہا کہ ہو سکتا ہے

یہ اُس کی بیٹی کی ہی لاش ہو لیکن اسے پہچانا نہیں جاسکتا۔ پبل داس نے

اُسے کہا کہ وہ بیان دے دے کہ یہ اُس کی بیٹی کی لاش ہے۔ باپ نہ

مانا۔ پبل داس نے اُسے کہا کہ وہ نہیں مانے گا تو سارے گاؤں میں مشہور

کر دیا جائے گا کہ شکوری اپنے ایک آشنا کے ساتھ گھر سے نکل گئی تھی

اور ایک اور آدمی کا اُس کے آشنا کے ساتھ گٹھ جوڑ ہو گیا پھر انہوں نے

شکوری کی آبروریزی کر کے اسے قتل کر دیا ہے۔

میں نے یہ ایک بات بتائی ہے جو پبل داس نے شکوری کے ماں

باپ سے کہی تھی۔ اُس نے ہمیں ننگی گالیاں دیں اور ایسی یہودہ باتیں

کہیں اور گرفتار کر لینے کی دھمکیاں دیں کہ دونوں نے مجبور ہو کر یہ لاش داس کے لئے ہوتے بیانات پر دستخط کر دیتے۔

”چھوٹے تھانیدار (نارائن) نے بھی آپ کو کچھ کہا تھا؟“
 ”کہتا تھا؟“ شکوری کے باپ نے کہا۔ ”وہ تو بار بار بڑے تھانیدار سے کہتا تھا کہ دونوں (میاں بیوی) کو حوالات میں بند کر دو۔ بڑا تھانیدار ایک گالی دیتا تھا اور چھوٹا تین دیتا تھا۔... میں نے بیان پر دستخط کر کے سوچا کہ یہی اچھا ہے کہ مشہور ہو جائے کہ میری بیٹی قتل ہو گئی ہے۔ ہم دونوں نے اپنے آپ کو یقین دلادیا ہے کہ ہماری بیٹی قتل ہو گئی ہے۔ اگر یہ نہ مانیں تو ساری عمر کا رونا ہے کہ نہ جانے بیٹی کہاں ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ ہو سکتا ہے کہ لاش جو انہیں دکھائی گئی تھی وہ اُن کی بیٹی کی ہی ہو لیکن میں اس شناخت کو تسلیم نہیں کرتا۔ میں نئے سرے سے تفتیش شروع کروں گا۔ میں نے میاں بیوی کو گھر بھیج دیا۔ انہیں کہا کہ کسی کے ساتھ کوئی بات نہ کریں اور دل سے غوف نکال دیں۔“
 ”اور دعا کریں۔“ میں نے کہا۔ ”اللہ کی ذات سے مایوس نہ ہوں۔ اللہ جو کرتا ہے وہ بندہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ دعائیں بڑی طاقت ہے۔“

لڑکی خوش تھی

لاش کی شناخت تین اور آدمیوں سے بھی کرائی گئی تھی۔ مجھے شکوری کے باپ کے نئے بیان کی تصدیق کرائی تھی جو ان تین آدمیوں سے پوچھ کر کے ہو سکتی تھی۔ میں نے ان تینوں کو بلوایا۔ گاؤں دو میل دور تھا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد تینوں آگئے۔ ان میں گاؤں کا نمبر دار بھی تھا۔ میں نے نمبر دار کو سب سے پہلے الگ بٹاکر لپیٹ میں لیا۔
 ”مجھے صرف یہ بتا دو کہ تم نے شکوری کی لاش کس طرح پہچانی تھی؟“
 میں نے پوچھا اور کہا۔ ”مجھے کوئی ایک نشانی بتا دو۔ جواب دینے سے

پہلے دل میں یہ بٹالو کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میرے پاس ہے۔ اس میں لاش کی حالت لکھی ہوتی ہے۔“
 وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”جھوٹ بولنے سے پہلے سوچ لو کہ جھوٹا بیان دینا جرم ہے۔“
 میں نے کہا۔ ”میں یہ جرم بخشوں گا نہیں۔“

”حضور والا!“ اُس نے کہا۔ ”میں نے پہل داس جی کو خوش کرنے کے لئے اُن کے لکھے ہوئے بیان پر انگوٹھا لگایا تھا۔ لاش کی صحیح شناخت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔“

مجھے یقین تھا کہ شخص جھوٹ بولنے کی حماقت نہیں کرے گا۔ وہ نمبر دار تھا۔ ہر تھانیدار کو خوش رکھنا اُس کا فرض تھا۔ نمبر دار ساری آدمی ہوا کرتے تھے۔ تھانیداروں کے آگے تو وہ سجدے کیا کرتے تھے لیکن بوقت ضرورت تھانیداروں کو دھوکہ بھی دے دیا کرتے تھے۔
 میں اس نمبر دار سے باز پرس نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اُس نے جھوٹی شناخت کیوں کی تھی۔ نمبر داروں کو تو جھوٹے گواہ مینا کرنے کو بھی کہا جاتا تھا اور وہ اس حکم کی تعمیل کرتے تھے ضرورت پڑتی تو خود بھی جھوٹی گواہی دے دیا کرتے تھے۔ اب میں اُس سے جتنے جھوٹ چاہتا بلوا سکتا تھا۔

”اب یہ بتاؤ کہ شکوری نام کی جو لڑکی لاپتہ ہوتی تھی وہ چال چلن کی کیسی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”اُس کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں سنی تھی۔“ اُس نے جواب دیا۔
 ”اُس کے ماں باپ شریف لوگ ہیں۔... اگر لڑکی نے درپردہ کسی کے ساتھ دوستی لگا رکھی تھی تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔“
 ”کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ وہ لاش کس کی تھی؟“

”نہیں حضور!“ نمبر دار نے جواب دیا۔ ”میں خود حیران ہوں کہ وہ لاش کس کی تھی۔ میرے گاؤں کی کوئی عورت لاپتہ نہیں۔“

اس کے بعد میں نے دوسرے دو آدمیوں کو باری باری بلایا اور ان سے یہی سوال پوچھا جو میں نمبر وار سے پوچھ چکا تھا۔ دونوں کو ڈرایا بھی۔ دونوں نے نمبر وار کی طرح صاف بتا دیا کہ انہیں نمبر وار تھانے لے آیا اور انہیں لکھے ہوئے بیان پر ٹھہ کر سنا تے گئے اور ان کے انگوٹھے لگوا لئے گئے تھے۔

تھانے میں قتل کا کیس درج تھا۔ میں نے علاقہ ڈی۔ ایس۔ پی کو لکھا کہ ابھی یہ کیس قتل کا نہیں، یہ تشدد کی کاکیس ہے۔ میں نے شکوری کے باپ، اُس کی ماں، نمبر دار اور دو اشخاص کے نئے بیان مختصراً لکھ کر ڈی۔ ایس۔ پی کو بھیج دیئے۔ اے۔ ایس۔ آئی نارائن کی بھی رپورٹ لکھی اور ڈی۔ ایس۔ پی کو بھیج دی۔ میں ضروری نہیں سمجھا کہ آپ کو یہ کارروائی تفصیل سے سناؤں۔ یہ بتا دیتا ہوں کہ تین چار روز بعد نارائن کو لاتن حاضر کرنے کا حکم آ گیا۔

اب میں نے شکوری کے لاپتہ یا اغوا ہونے کی باقاعدہ تفتیش شروع کی۔ اُسے لاپتہ ہوتے دو ہفتے گزر گئے تھے۔ میں نے سب سے پہلے شکوری کے باپ سے پوچھ گچھ کی۔ اُس نے اپنی بیٹی کی شرافت کا ذکر کیا جو میرے لئے قابل قبول نہیں تھا۔

باپ کے بیان کے مطابق، وہ لاپتہ اس طرح ہوئی کہ صبح ابھی دروازہ کھیرا ہی تھا جب اُس کی ماں روزمرہ کے مطابق جاگی۔ شکوری بستر پر نہیں تھی گھر میں دیکھا کہ میں بھی نہیں تھی۔ بڑے دروازے کی اندر والی کنڈی ہی نہیں، ایک کوڑا کھلا ہوا تھا۔ وہ اتنی سویرے کبھی باہر نہیں نکلی تھی۔ سوزج طلوع ہو گیا۔ شکوری نہ ملی۔ ماں نے دیکھا کہ اُس کے سیلے پر جو وہ گھڑیں پہنا کرتی تھی، اُس کی چار پائی کے پاس پڑے تھے۔

”اُس کی باقی جوڑیاں دکھی تھیں؟“ میں نے پوچھا۔ ”ان میں سے کوئی جوڑا پہن گئی ہوگی۔“

”اُس کی تین جوڑیاں تھیں۔ دو سینڈل اور ایک دیسی جوتی۔“ اُس

کے باپ نے کہا۔ ”وہ نہیں پڑی ہیں۔“
میرے ذہن میں سوال اُٹھے۔ کیا وہ ننگے پاؤں گئی ہے کیا اُسے اٹھایا گیا ہے؟ اٹھا لے جانے کی صورت میں آدمی دو یا اس سے زیادہ ہوں گے۔ ننگے پاؤں جانے کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اُسے اٹھا کر لے جایا گیا ہے یعنی زبردستی۔

شکوری کے متعلق پتہ چلا کہ اُس کی منگنی ہو چکی ہے اور اُس کا منگتر فوج میں ناک ہے۔ میں نے وہ تمام سوال پوچھے جو اس قسم کی وارداتوں میں پوچھے جاتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ کسی کے ساتھ دشمنی نہیں۔ لڑکی کے رشتے کے امیدوار تین تھے۔ ایک کو رشتہ دیا گیا۔

”کیا دوسرے دو ناراض ہوئے تھے؟“

”یہ تو قدرتی بات ہے۔“ شکوری کے باپ نے جواب دیا۔ ”انہوں نے مجھے شکوے کئے تھے۔“

”ان میں سے کسی نے کوئی دھمکی دی تھی؟“

”نہیں۔“ باپ نے جواب دیا۔ ”وہ ایسے لوگ نہیں۔“

میں نے شکوری کی ماں کو بلایا۔ مائیں اپنی بیٹیوں کی راز دان ہوتی ہیں۔ میں نے ماں کو اپنے سامنے بٹھایا اور اُسے ایک بار پھر یقین دلایا کہ وہ ڈرے اور گھبراتے نہیں۔

”میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ آپ کی بیٹی کو زندہ برآمد کرنے کے لئے کہہ رہا ہوں۔“ میں نے اُسے کہا۔ ”مجھے بتائیں کہ شکوری کی منگنی ہوتی تو وہ خوش تھی یا اُداس ہو گئی تھی۔“

”وہ خوش تھی۔“ ماں نے جواب دیا۔

”ماں بیٹیاں آپس میں دل کی بات کہہ سکتی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”اُس نے آپ کو اپنی پسند بتاتی ہوگی۔“

”میں آپ کا مطلب سمجھ گئی ہوں۔“ ماں نے کہا۔ ”میری بیٹی کا دھیان کسی اور کی طرف نہیں تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔ لڑکا بڑا خوبصورت

کی تمام خواتین گھر میں ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ننگے پاؤں گتی ہے۔ میں اب یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ جو لاش ملی تھی، اس کے پاؤں میں جوئی تھی یا نہیں۔

شکوری کے ماں باپ سے جوئی کے متعلق نہیں پوچھا تھا۔ لاش کی برآمدگی کے وقت ایک ہیڈ کانٹیل اور دو کانٹیل موجود تھے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ہیڈ کانٹیل نے بتایا کہ کپڑوں کے ٹکڑے موجود تھے اور لاش کے پاؤں میں ویسی جوئی کا جوڑا تھا۔ سب انسپکٹر ہیل داس نے جوئی تھانے میں آکر آماری اور پھینک دی تھی۔

مجھے ایک اور شک ہونے لگا۔ یہ لاش جس عورت کی بھی تھی، اسے سب انسپکٹر ہیل داس نے مروایا ہوگا۔ لاش کی غلط شناخت کر کے اس نے اپنے مجرم پر پردہ ڈال لیا تھا۔

”وہ جوئی شاید مل جاتے“ ایک کانٹیل نے کہا۔ ”تھانے میں ایک بھنگی اور اس کی بیوی کام کرتے ہیں۔ جوئی بھنگن لے اٹھالی تھی۔۔۔ شلوار قمیض کے ٹکڑے چھوٹے چھوٹے تھے۔“

”رنگ یاد ہے؟“

”لال یا جامنی“۔ ہیڈ کانٹیل نے کہا اور دونوں کانٹیلوں نے تائید کی۔

”لاش کس سے اٹھواتی گئی تھی؟“

”گاؤں سے ایک منٹلی اور ایک بھنگی آتے تھے۔“

میں نے ہیڈ کانٹیل سے کہا کہ وہ متعلقہ گاؤں جاتے اور ان دونوں کو ساتھ لے آتے اور ایک کام یہ بھی کرتا آتے کہ جہاں سے لاش برآمد ہوتی تھی وہاں جاتے۔ شاید کپڑوں کا کوئی ٹکڑا وہاں پڑا مل جاتے۔

اُسے بھیج کر میں نے بھنگن کو بلا یا۔ میں نے سوچا کہ لڑکی گھر سے ننگے پاؤں نکلی ہوگی اور جس کے ساتھ گتی ہے وہ دوسری جوئی ساتھ لایا ہوگا تاکہ گھر نہ پہچانا جاسکے۔ اگر ایسا ہوا ہے تو وہ آدمی جرائم کا تجربہ رکھتا

جوان ہے اور زمیندار خاندان کا ہے۔ ہم یہی رشتہ چاہتے تھے۔ آپ ہمارے گھر آکر دیکھیں۔ شکوری اپنے ہاتھوں اپنے پیڑے تیار کر رہی تھی۔ دن رات دوپٹوں کی کڑھائی میں لگی رہتی تھی۔“

شکوری کی عادتوں کے متعلق ماں نے بتایا کہ ہنسنے کھیلنے والی تھی۔ سیلیوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتی تھی اور نماز روزے کی پابند تھی۔ اس کی جب منگنی ہوگئی تو اس نے شکر لانے کے نفل پڑھے تھے۔

یہ تو ماں باپ کی باتیں تھیں۔ ان میں مبالغہ ہو سکتا تھا۔ اگر شکوری نماز روزے کی پابند تھی تو بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ منگیت رہی کو چاہتی تھی اور اس کا دھیان کسی اور کی طرف نہیں تھا۔ میں نے بعض نمازی اور بار بار لڑکیاں دیکھی ہیں جو اپنی پسند کے آدمی کو حاصل کرنے یا اس کے ساتھ گھر سے نکل جانے اور پڑے نہ جانے کے لئے ہر نماز کے بعد دعا اور وظیفہ کیا کرتی تھیں۔ جوانی کے جذبات ایسے ہوتے ہیں کہ مذہب کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں کبھی شدت اختیار کر لیتے ہیں تو نماز روزے پر غالب آجاتے ہیں۔ شکوری کے متعلق صحیح راتے کسی اور سے لیسی تھی۔

جوئی جو بھنگن نے سپن لی

مجھے یہ خیال تو بار بار آتا تھا کہ ہو سکتا ہے وہ لاش شکوری کی ہی ہو۔ میں نے اس کے باپ سے اور ماں سے اس کی عمر، اس کا خلیہ اور اس کا رنگ وغیرہ پوچھ لیا تھا۔ یہ وہی خلیہ تھا جو انہوں نے لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ کے ساتھ کھوایا تھا۔

پوسٹ مارٹم کرنے والا ڈاکٹر میری کچھ مدد کر سکتا تھا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ لاش کے ساتھ اس کے کپڑے بھی ہوں گے۔ کیا جوئی بھی تھی؟ یہ تو شکوری کا باپ اور اس کی ماں بھی بتا چکی تھی کہ اس

ہوگا۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ جرائم پیشہ ہو۔
مجھے بتایا گیا کہ بھنگی یہاں نہیں ہے۔ اُسے ڈھونڈ لانے کے لئے
ایک کانشیل چلا گیا۔ میں سول سرجن کے پاس چلا گیا۔ اُسے پوسٹ مارٹم
رپورٹ دکھائی۔ کیس چند دن پہلے کا تھا۔ اُسے یاد آگیا۔ میں نے اُسے اپنا
مسئلہ بتایا۔ اُس نے پوچھا کہ لاپتہ لڑکی کی عمر کتنی تھی۔ میں نے انیس سال
بتائی۔ رنگ بھی بتایا۔

”لاش کی حالت ایسی تھی کہ اُس کی روح واپس آجاتی تو وہ بھی اپنے
جسم کو نہ پہچان سکتی۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”سُر کے بال باقی تھے۔ ایک ٹانگ
کا کچھ حصہ محفوظ تھا اور جسم پر کہیں کہیں گزشت تھا۔ چہرہ تو سمجھو کہ تھا ہی
نہیں۔“ ڈاکٹر نے ذرا سوچ کر کہا۔ ”لاش جو ان عورت کی معلوم ہوتی
تھی اور غالباً رنگ بھی ایسا ہی تھا لیکن یہ صرف قیاس ہے۔“
ڈاکٹر مہری راہنمائی کرنے سے معذور تھا۔ وہ موت کا وقت بھی
نہ بتا سکا۔

میں وہاں سے تھانے آیا تو بھنگن موجود تھی۔ اُس سے لاش کی جوئی
کے متعلق پوچھا تو اُس نے بتایا کہ اُس نے وہی جوئی پہن رکھی ہے بل و اس
نے جوئی پھینک دی تھی۔ بھنگن نے اُسٹھا کہ پہن لی۔ میں نے جوئی اتر وا کر
اپنے دفتر میں رکھوالی۔

کیا لڑکی اپنی مرضی سے گئی؟

ہیڈ کانسٹیبل گاؤں سے واپس آیا تو سورج غروب ہونے کو تھا۔
وہ کپڑے کا ایک بالشت ٹکڑا لے آیا تھا۔ اُس کے ساتھ سُٹلی اور بھنگی کے
علاوہ شکوری کا باپ بھی تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل عقل والا آدمی تھا۔ وہ کپڑے
کا ٹکڑا شکوری کے گھر لے گیا اور ڈھلوا کر اُس کی ماں کو دکھایا تھا۔ ماں
نے کہا تھا کہ شکوری نے اس رنگ کے کپڑے کبھی نہیں پہنے تھے اور

جس رات وہ لاپتہ ہوئی اُس رات اُس نے لٹھے کی شلوار اور سوئی کپڑے
کی سفید قمیض پہنی ہوئی تھی۔

میں نے جوئی شکوری کے باپ کو دکھائی۔ اُس نے کہا کہ شکوری
کی کوئی جوئی اس قسم کی نہیں تھی۔ باپ کو یقین تو تھا لیکن جوئی شکوری
کی ماں کو دکھانی ضروری تھی۔ مجھے ایسے کرنا تو نہیں چاہیے تھا لیکن
میں نے جوئی ایک کپڑے میں پلیٹ کر شکوری کے باپ کو دے دی
اور اُسے کہا کہ یہ کسی اور کو نہ دکھائے، اپنی بیوی کو دکھا کر کل علی الصبح
میرے پاس لے آئے۔ میں شکوری کی ماں کو بار بار تھلے بلانا مناسب
نہیں سمجھتا تھا۔ شکوری کے باپ کو میں قابلِ اعتماد سمجھنے لگا تھا۔ اُسے
میں نے رخصت کر دیا۔

مُسّلی اور بھنگی نے بھی لاش کی حالت بیان کی۔ ان کا کام صرف
اُٹنا تھا کہ لاش کو چار پاتی پر اس طرح ڈالیں کہ اس کا کوئی حصہ الگ نہ
ہو۔ اُنہوں نے یہ کام کر دیا۔ چار پاتی گاؤں کے چار آدمی اُسٹھا کر قصبے
کے سول ہسپتال تک لے گئے تھے۔ مُسّلی اور بھنگی نے بتایا کہ لاش کے
کپڑے لاش کو کھانے والے درندوں نے بُری طرح پھاڑ ڈالے تھے۔
جوئیاں دولوں پاؤں میں تھیں۔

لاش تقریباً دو فٹ گہرے گڑھے میں دفن کی گئی تھی۔ بارش
اتنی زیادہ ہر سی کہ لاش ننگی ہو گئی اور گیدڑ اور اُود بلاق وغیرہ پہنچ گئے۔
وہ ویران علاقہ تھا۔ عام گزرگاہ نہیں تھی۔ اتفاق سے ایک آدمی گزرا
اور اُس نے گاؤں کے نمبر دار کو اطلاع دی۔ اُس وقت تک لاش
کھائی جا چکی تھی۔

مُسّلی اور بھنگی سے میں نے اپنے کام کی باتیں معلوم کر لیں اور
انہیں جانے کی اجازت دے دی۔

اگلے تین دن دوسرے کیسوں میں گزر گئے۔ اس کیس کی طرف
میں توجہ نہ دے سکا۔ چوتھے روز اے۔ ایس۔ آئی نارائن لائن حاضر

ہونے کے لئے چلا گیا اور اسی رات میرے پاس ایک اور اسے۔ ایس۔ آتی
آگیا۔ وہ بھی ہندو تھا۔ اُس نے بتایا کہ میری رپورٹ پر سب انسپکٹر ہیل داس
کو بھی لاتن حاضر کر دیا گیا ہے۔

کپڑوں کے ٹکڑے اور جوتی کی وجہ سے میں اب اعتماد اور دلیری
سے بات کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ شکوری کا باپ جوتی واپس کر گیا
تھا۔ اُس کی بیوی نے کہا تھا کہ یہ جوتی شکوری کی نہیں۔ لہذا یہ لاش
شکوری کی نہیں تھی۔

میں نے ایک اور ثبوت حاصل کر لیا۔ جس روز بارش برسی تھی
اُس وقت میں اس تھانے میں نہیں آیا تھا۔ وہاں بارش تو چند دنوں کے
وقفے سے برسی ہی تھی۔

میں نے اُس بارش کی تاریخ معلوم کر لی جس نے لاش ننگی کر دی
تھی۔ یہ میں نے تھانے کے عملے سے اور کچھ اور لوگوں سے معلوم کی تھی۔
میں نے لڑکی کی گمشدگی کی تاریخ دیکھی تو وہ ایک روز بعد کی تھی۔ مجھے
اب یہ حساب اچھی طرح یاد نہیں رہا۔ اتنا یاد ہے کہ لڑکی کے لاپتہ ہونے
کی تاریخ، بارش کی تاریخ اور لاش کی برآمدگی کی تاریخ کو سامنے رکھ
کر دیکھا تو ان میں مطابقت نہیں بنتی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں یہ
توصاف لکھا تھا کہ لاش پر جو گوشت رہ گیا تھا (خصوصاً ایک ٹانگ) اس
سے پتہ چلتا ہے کہ مقتولہ کو مرے دو سے زیادہ دن گزر گئے ہیں لیکن
دن اور وقت کا صحیح تعین نہیں کیا جاسکا تھا۔

اس دوران سب انسپکٹر ہیل داس کا زبانی پیغام ملا کہ میں اُس
کی نوکری کو بچانے کی خاطر اس کیس کو آگے نہ بڑھنے دوں اُس نے
یہ بھی کہا تھا کہ وہ میری خدمت میرے مطالبے کے مطابق کرنے
کو تیار ہے۔ میں نے اُسے جواب بھیجا کہ مجھے بھی نوکری کرنی ہے اور
یہاں بھی کسی کے آگے جوابدہ ہوں اور خدا کے آگے بھی!
ابھی یہ معلوم کرنا باقی تھا کہ لڑکی اپنی مرضی سے گئی ہے یا اسطاتی

گئی ہے۔

یہ مجھے اُس کی ہسیلیوں سے معلوم ہو سکتا تھا۔ میں نے ارادہ کیا
تھا کہ گاؤں جاؤں گا اور شکوری کے گھر بیٹھ کر اُس کی ہسیلیوں سے پوچھوں
گا۔ میں چلنے ہی لگا تھا کہ اس گاؤں کا نمبر دار آگیا۔ نمبر دار تھانیداروں
کے زیرِ نگرانی غلام ہوتے تھے اور دھوکہ بھی دے جاتے تھے لیکن یہ
نمبر دار میرے آگے بچھنے کو تیار رہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لاش کی
شناخت کے متعلق اُس کا جھوٹا بیان اس کیس کے ریکارڈ میں تھا۔ وہ ڈرتا
تھا کہ میں اُس کے خلاف کارروائی کروں گا۔ نمبر دار کے ساتھ ایک بوڑھا
آدمی تھا۔ نمبر دار ہندو تھا اور یہ بوڑھا مسلمان۔

”مک صاحب! نمبر دار نے مجھے الگ کر کے کہا۔ ایک اطلاع
لایا ہوں۔ آپ غور کریں۔ اگر بہتر سمجھیں تو گمشدگی کی ایک اور رپورٹ
درج کر لیں۔۔۔۔۔ یہ بوڑھا جو میرے ساتھ آیا ہے، اس کا جوان بیٹا جو دو
بچوں کا باپ ہے، پندرہ سولہ دنوں سے لاپتہ ہے۔“
”شکوری کو لاپتہ ہونے اتنے ہی دن گزر چکے ہیں نا!“ میرے
منہ سے نکل گیا۔

”میں نے حساب کیا ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”وہ شکوری کے لاپتہ
ہونے کے تیسرے روز کہیں گیا تھا پھر واپس نہیں آیا۔“

ایک ہی بار بہت سے سوال میرے سامنے آگئے۔ مجھے ایسے نظر
آنے لگا جیسے شکوری اس آدمی کے لئے گھر سے گئی ہے۔ یہ آدمی شکوری
کو رات ہی رات کہیں چھوڑ آیا اور دو تین روز بعد گاؤں میں موجود رہا
تاکہ اُس پر شک نہ ہو۔

میں نے اس آدمی کے متعلق ہزار سے سب کچھ پوچھ لیا۔ اُس نے بتایا
کہ یہ بوڑھا اپنے بیٹے کی گمشدگی کی رپورٹ کھوانے آیا ہے۔

ایک منجر لاپتہ ہو گیا

گمشدہ بیٹے کا نام علی رضا تھا۔ ان لوگوں کی زمینداری اچھے پیمانے کی تھی۔ علی رضا کی عمر ستائیس اٹھائیس سال تھی۔ خوبصورت جوان تھا۔ وہ پولیس کا منجر بھی تھا۔ سب انکی پڑھل داس اُس پر اعتبار کرتا تھا۔ علی رضا غنڈوں کی طرح بد معاش نہیں تھا لیکن وہ شریف آدمی بھی نہیں تھا۔ ”شکوری کے ساتھ اُس کا کوئی تعلق تھا؟“

”شاید نہیں“ منبر دار نے جواب دیا۔ ”میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”کیا علی رضا اور شکوری کے باپ کا دوستاں تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”علی رضا اُن کے گھر جاتا تھا؟“

”نہیں“ منبر دار نے جواب دیا۔ ”شکوری کا گھر انہ بہت شریف ہے۔“

”اگر میں کہوں کہ شکوری کو علی رضا نے غائب کر لیا ہے اور تین چار روز بعد اُسے کسی کے ہاتھ بیچنے کے لئے چلا گیا ہے تو تم کیا کہو گے؟ کیا علی رضا اتنا سنگین مجرم کر سکتا ہے؟“

”نہیں“ منبر دار نے جواب دیا۔ ”اُس میں اتنی دلیری نہیں“

میری راہنمائی کے لئے صرف منبر دار ہی نہیں تھا اور یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ شکوری کو علی رضا نے ہی اغوا کر لیا ہو یا شکوری علی رضا کے ساتھ خود گئی ہو۔ مجھے سراسر غسانی کے لئے کئی اور ذرائع استعمال کرنے تھے۔ میری کمزوری یہ تھی کہ میں اس علاقے میں نیا تھا۔ منجروں کے ساتھ میرا تعارف کرایا گیا تھا۔ بعض کا تعارف غائبانہ ہوا تھا۔ مجھے یاد آنے لگا کہ پہل داس نے علی رضا کا نام لیا تھا اور کہا تھا کہ وہ کہیں باہر چلا

گیا ہے۔ ”شکریہ“ میں نے منبر دار سے پوچھا۔ ”گاؤں میں اس قسم کی کوئی عورت ہے؟“

”بڑی بچی عورت ہے جی!“ اُس نے میرا اشارہ سمجھتے ہوئے جواب دیا۔ ”محم ہوتو بیچ دوں؟ آسمان سے تار سے توڑ لاتی ہے“

میں نے ایک کانٹیل کو بلا کر منبر دار شکریہ سے کہا کہ وہ اس کانٹیل کو اس عورت کا گھر سمجھائے۔ کانٹیل سے کہا کہ وہ اس عورت کو ساتھ لے آئے۔ وہ چلا گیا تو میں نے علی رضا کے باپ کو بلایا اور اُس سے علی رضا کے متعلق پوچھا۔

”وہ اتنے دنوں کے لئے گھر سے باہر کبھی نہیں گیا تھا“ علی رضا کے باپ نے بتایا۔ ”اگر دو تین دنوں کے لئے کہیں جاتا تھا تو گھر بتا کر جاتا تھا۔ اب وہ کچھ بھی نہیں بتا کر گیا اور سولہ سترہ دن گزر گئے ہیں جہاں جہاں خیال تھا کہ وہ گیا ہو گا وہاں سے پوچھ آیا ہوں۔ اُس کی ماں اور بیوی بہت پریشان ہیں“

”نہیں کیا شک ہے؟“ میں نے اُس کے باپ سے پوچھا۔ ”کیا تم اُس کی جان کا خطرہ محسوس کر رہے ہو؟“

”وہ جہاں کہیں ہے، خدا اُسے زندہ اور تندرست رکھے۔ باپ نے روتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے اُس کی جان کا ڈر ہے۔“

”کسی کے ساتھ دشمنی تھی؟“

”پورا اور ڈاکو اُس کے دشمن تھے۔“ اُس نے کہا۔ ”وہ پولیس کا منجر تھا۔ اُس نے کئی مجرم پکڑوائے تھے۔“

مجھے یہی ارکان نظر آیا۔ منجروں کو ہم خفیہ رکھا کرتے تھے لیکن بڑے ڈاکوؤں کے جاسوس تھا انوں میں موجود ہوتے تھے۔ ان سے وہ معلوم کر لیتے تھے کہ منجر کس نے کی ہے۔ اس طرح منجروں کی جان خطرے میں رہتی تھی۔ علی رضا کے معاملے میں میری دلچسپی یہ تھی کہ اُس کے لاپتہ

ہونے کا تعلق شکوری کے لاپتہ ہونے کے ساتھ ہے یا نہیں۔

میں اس کے مطابق تفتیش کر رہا تھا۔

علی رضا کے باپ نے مجھے کہا کہ میں باقاعدہ رپورٹ درج کروں یا جو کچھ بھی کروں، میں علی رضا کو ڈھونڈنے کا انتظام کروں مجھے جو نیا اسے۔ ایس۔ آئی دیا گیا تھا، وہ عمر کے لحاظ سے تجربہ کار نظر آتا تھا۔ میں نے علی رضا کی گمشدگی کا یہ کیس اسے دے دیا اور اسے یہ بھی کہا کہ وہ خیال رکھے کہ علی رضا کی گمشدگی کا تعلق شکوری کی گمشدگی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

لاپتہ ہو جانے والوں کی تلاش کے لئے محاذ انڈیا کیس کا جی کارروائیاں کی جاتی ہیں۔ دوسرے محاذوں کو لاپتہ فرد کا تھیلہ اور عمر وغیرہ مکھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ کارروائیاں ہوتی ہیں۔ میں آپ کو ان کارروائیوں کی تفصیلات میں نہیں لے جا رہا۔ اس میں بدورت کے سوا کچھ نہیں۔

میں نے علی رضا کے باپ کو اسے۔ ایس۔ آئی کے حوالے کیا اور نمبر وار کو ساتھ لے کر اس کے گاؤں کو چل پڑا۔ راستے میں نمبر وار سے سوال جواب کرتا گیا۔ اس نے بتایا کہ شکوری بہت خوبصورت لڑکی ہے۔ علی رضا کی بات ہوتی تو اس نے بتایا کہ یہ شخص عورتوں کا رسیا ہے۔ نمبر وار نے خیال ظاہر کیا کہ علی رضا کسی عورت کے پیچھے بڑ گیا ہوگا اور عورت نے اسے اپنے خاندان یا بھائیوں کے ہاتھوں مروادیا ہوگا۔

یہ تو مردوں کی عادت ہے

شکوری کے گھر جا کر پہلے تو ان کا مکان دیکھا۔ شکوری الگ کمرے میں سوتی تھی جو اس کمرے کے ساتھ ملا ہوا تھا جس میں اس کا باپ اور اس کی ماں سوتی تھی۔ دونوں کمروں کے درمیان دروازہ تھا۔ شکوری کے کمرے

کا دوسرا دروازہ برآمدے میں کھلتا تھا۔ جس رات شکوری گئی اس رات یہ دروازہ اندر سے کھلا ہوا پایا گیا تھا۔

اب اتنے دنوں بعد یہ موقع دیکھنا بیکار تھا۔ میں نے شکوری کی ماں سے پوچھا کہ شکوری کی گہری ہسیلیاں کون کون ہیں۔ اس نے مہین کا نام لیا۔ میں نے نمبر وار سے کہا کہ وہ مہینوں گھروں میں جاتے اور ان لڑکیوں کو بلالائے اور ان کے باپوں کو بھی ساتھ لیتا آتے۔

مٹھوڑی ویر بعد مہین لڑکیاں آگئیں۔ ان کے باپ ساتھ تھے۔ میں نے باپوں کو اپنے پاس بٹھا کر کہا کہ کوئی فکر نہ کریں نہ ڈریں۔ ان لڑکیوں سے شکوری کے متعلق کچھ پوچھنا ہے۔ انہیں تسلیاں دے کر میں لے ایک لڑکی کو اپنے پاس بٹھالیا اور اسے بتایا کہ اس کی ہسیلی قتل نہیں ہوتی زندہ ہے۔

”کہاں ہے؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

”میری تو میں معلوم کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم میری کچھ مدد کرو۔ میں اسے انشاء اللہ زندہ لے آؤں گا۔۔۔ مجھے یہ بتاؤ کہ شکوری کسی اور کو چاہتی تھی؟“

”نہیں جی!“ لڑکی نے پکے یقین کے لہجے میں کہا۔ ”مجھ سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا۔ وہ کسی اور کو نہیں چاہتی تھی۔ سنگتی ہوتی تو اس پر وہ بہت خوش تھی۔“

”لاپتہ ہونے سے پہلے وہ تمہیں کب ملی تھی؟“

”دو روز پہلے!“

”اس روز بھی وہ خوش تھی؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم نے اس میں

کوئی تبدیلی نہیں دیکھی تھی؟“

”کوئی تبدیلی نہیں دیکھی۔“ لڑکی نے جواب دیا۔

اس لڑکی کے بعد میں نے دوسری دو ہسیلیوں سے باری باری پوچھ گچھ کی۔ انہوں نے بھی ایسی ہی باتیں بتائیں۔ میں نے ان پر بہت جرح کی تھی

لیکن تینوں لڑکیوں نے کہا کہ شکوری کسی کو نہیں چاہتی تھی اور اپنی منگنی پر وہ بہت خوش تھی۔

میں نے لڑکیوں کو فارغ کر دیا اور شکوری کے ماں باپ کو تسلی دی کہ میں ان کی بیٹی کو ڈھونڈ نکالوں گا۔

”ابھی گئی تو کیا ہوگا“ شکوری کی ماں نے کہا۔ ”بدنامی تو ہمارے منہ پر چلی گئی ہے۔ پہلے یہ جانتے ہوئے کہ یہ لاش ہماری بیٹی کی نہیں ہم نے کہہ دیا تھا کہ ہماری بیٹی کی لاش ہے۔ تھانیدار نے ہماری بے عزتی تو بہت کی تھی لیکن ہم نے سب سے کہا کہ لڑکی کو کوئی اٹھالے گیا اور اسے قتل کر دیا ہے۔ اب آپ نے اسے پھر زندہ کر دیا ہے تو یہ بات سارے گاؤں میں مشہور ہو گئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ان کی بیٹی کسی کے ساتھ چلی گئی ہے۔ ہم نے بیٹی کی منگنی کر دی تھی۔ ادھر سے پیغام آیا ہے کہ لڑکی کا چال چلن ٹھیک نہیں۔ انہوں نے منگنی توڑ دی ہے۔ وہ آگئی تو اسے کون قبول کرے گا؟“

اُن کے اس مسئلے کا میرے پاس کوئی حل نہیں تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ پہلے لڑکی مل جائے تو دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے۔ یہ طفل تسلی تھی جو میں نے انہیں دی اور نمبر دار کے ساتھ اُس کے گھر چلا گیا۔ اُسے کہا کہ اُس عورت کو لے آؤ۔

وہ ایک عورت کو ساتھ لے آیا۔ اُس کی عمر تیس سال سے اوپر تھی۔ اچھی شکل و صورت کی عورت تھی۔ اس قسم کی عورتوں کے متعلق میں اپنی کہانیوں میں بہت کچھ بتا چکا ہوں۔ یہ ایک سیدھے سادے بلکہ احمق اور بڑے ہی بد صورت خاوند کی بیوی تھی۔ چہرے اور آنکھوں سے پتہ چلتا تھا کہ تیز عورت ہے مگر گھر کی خدمت کرتی اور روزی کھاتی تھی۔ خفیہ پیغام بھی ادھر ادھر لے جاتی تھی۔ نمبر دار اسے مخبری کے لئے بھی استعمال کیا کرتا تھا۔ یہ اُس کا ذریعہ معاش بھی تھا اور شغل بھی۔

میں نے نمبر دار کو باہر بھیج دیا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے اس عورت سے پوچھا۔
”اپنا پورا نام تو مجھے بھی یاد نہیں رہا۔“ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ماں باپ سٹو کہا کرتے تھے۔ گاؤں والے بھی سٹو کہتے ہیں آپ بھی سٹو کہہ لیں۔“

اُس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ تھی، اسے میں بڑی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ یہ بڑی کشش والی مسکراہٹ تھی جس میں یہ پیغام ہوتا ہے۔ ”میں تمہاری ہوں۔“ سٹو کی آنکھوں میں ایک تاثیر تھا۔ عام قسم کا آدمی اس تاثر سے بچ نہیں سکتا تھا۔ ان آنکھوں میں اور اس مسکراہٹ میں جو حسن تھا اس میں شرم اور حیا نہیں تھی۔

”سٹو“ میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ ”تم تو میرے کام کی چیز ہو۔ نمبر دار نے تمہاری بہت تعریفیں کی ہیں۔ میں تمہیں تھانے کا سرکاری اور خفیہ مخبر بنالوں گا۔ ماہوار تنخواہ لگوا دوں گا اور انعام الگ ہوگا۔ تم نمبر دار کے لئے مخبری کرتی ہو۔ کتنی رہہ میکن وہ تمہیں کیا دیتا ہے؟“

”تمہاروں پر کچھ دے دیتا ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”اور.... کیا بتاؤں....“

”اور وصول بھی کر لیتا ہے۔“ میں نے بے تکلفی سے کہا۔
”آپ خود بیانے ہیں۔“ اُس نے بڑی بھٹی مسکراہٹ سے کہا۔
”کبھی اُس کی بیوی گھر نہ ہوتی تھی گھر بلا لیتا ہے یا میرا خاوند گھر نہ ہوتا میرے گھر آ جاتا ہے.... اور جو دیتا ہے وہ پورا کر لیتا ہے.... آپ حکم کریں۔“
”میرا کوئی حکم نہیں سٹو!“ میں نے کہا۔ ”جو کام کرو گی اُس کے پیسے دلاؤں گا اور میرا ہاتھ ہمیشہ تمہارے سر پر رہے گا۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ میں جو پوچھوں وہ بالکل سچ بتاؤں گا.... کیا تمہیں معلوم ہے میں نے تمہیں کیوں بلا یا ہے؟“

”وہ ایک لڑکی کہیں چلی گئی ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”شکوری....“

آپ شاید اُس کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتے ہیں؟
 ”ہاں!“ میں نے کہا۔ ”پہلے یہ بتاؤ کہ وہ کیسی لڑکی تھی؟“
 ”صاف لڑکی تھی۔“ سلتو نے کہا۔ ”نیک اور بالکل پاک میں حیران
 ہوں کہ وہ کس طرح چلی گئی ہے۔“

”تم اناطری معلوم ہوتی ہو؟“ میں نے کہا۔ ”کیا تم نے ایسی بہترین
 عورت کبھی نہیں دیکھی جو سات پردوں میں بیٹھی رہتی ہے؟“
 ”میں ویسے ہی بات نہیں کر رہی۔“ اُس نے کہا۔ ”علی رضا اس
 لڑکی کو چاہتا تھا۔ وہ دو بچوں کا باپ ہے مگر جس عورت پر نظر رکھ لے اُس
 پر وہ بہت خرچ کرتا ہے۔ شکوری باہر بھی نکلا کرتی تھی۔ علی رضا اُس
 کے راستے میں کھڑا ہو جاتا تھا لیکن شکوری نے کبھی اُس کی طرف دیکھا بھی
 نہیں تھا۔ علی رضا اس لئے شیر ہو گیا تھا کہ شکوری کا کوئی بھائی نہ تھا۔ باپ
 اُس کا بوڑھا اور بھلا مانس ہے۔۔۔ علی رضا نے مجھے کہا کہ شکوری تک پیغام
 پہنچا دو۔ میں نے شکوری کے گھر آنا شروع کر دیا اور اُس کے ساتھ بے لگنی
 پیدا کر لی۔“

”علی رضا کون ہے؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ”کوئی جاگیردار
 ہے یا۔۔۔۔“

”جاگیردار تو نہیں۔“ سلتو نے جواب دیا۔ ”امیر زمیندار ہے۔
 بہت دولتوں سے کہیں گیا ہوا ہے۔“

”تمہارے خاوند کی طرح اُس کی بیوی اچھی شکل و صورت کی نہیں ہو
 گی۔“ میں نے کہا۔

”آپ دیکھیں تو حیران رہ جائیں کہ یہ شخص اتنی خوبصورت بیوی کے
 ہوتے ہوئے باہر جھک مارتا پھر رہا ہے۔“ سلتو نے کہا۔ ”لیکن سرکاری
 بیوی نے بھی پورا انتقام لیا ہے۔ معمولی سے ایک آدمی کے ساتھ اُس نے
 یاراہ گانٹھ رکھا ہے۔ آپ سیالے ہیں۔ جس گھر کامر و عیش موج کرنے کا
 تو اُس گھر کی جوان عورتیں بھی اسی راستے پر چلیں گی۔“

”سنا ہے شکوری بہت خوبصورت لڑکی ہے!“ میں نے کہا۔
 ”خوبصورت تو ہے۔“ سلتو نے کہا۔ ”لیکن اُس کا چہرہ بڑا معصوم
 ہے اس لئے بہت اچھا لگتا ہے۔“

سلتو نے مجھے وہ الفاظ بتاتے اور وہ طریقے بھی بتاتے جو اُس
 نے شکوری کے دل پر قبضہ کرنے کے لئے استعمال کئے تھے۔ یہ بڑا مشکل
 فن ہے۔ سلتو تجربہ کار فنکارہ تھی۔ اُس نے اُسادی سے شکوری کو ایلی بنا
 لیا اور ایک روز اُس کے آگے علی رضا کا پیغام رکھ دیا۔ یہ ناجائز دوستی
 کا پیغام تھا۔ شکوری نے اُسے ٹال دیا لیکن شریفانہ طریقے سے۔

سلتو کا یہ پیشہ تھا۔ وہ اس قسم کی بات کرنے کا ڈھنگ جانتی تھی۔ اُس
 نے ایک روز پھر شکوری سے کہا کہ علی رضا اُس کی محبت میں پاگل ہو جا رہا
 ہے۔ شکوری نے اب سختی سے سلتو کو ایسی بکواس سے منع کیا۔

”میں نے علی رضا کو مایوس نہ کیا۔“ سلتو نے مجھے بتایا۔ ”اُس
 سے مجھے پیسے ملتے تھے۔ میں اُسے کہتی تھی کہ شکوری مان جائے گی۔۔۔۔

ایک روز علی رضا نے مجھے راتے میں روک لیا اور بہت گالیاں دیں۔ میں
 اُسے بتاتی رہی تھی کہ شکوری نے اُس کی محبت قبول کر لی ہے لیکن سنواری

ہے اور نا تجربہ کار اس لئے ڈرتی اور شرماتی ہے۔ علی رضا کو شکوری کہیں
 باقی مل گئی۔ علی رضا نے اُسے روک لیا اور کوئی بات کہہ دی۔ شکوری نے

اُس کی بے عزتی کر دی اور اُسے کہا کہ میں تیرے منہ میں پیشاب بھی نہ
 لروں۔ علی رضا مجھے کہتا تھا کہ میں نے اُسے دھوکے میں رکھا اور اُس

کی بے عزتی کرواتی ہے۔ پھر ایک روز شکوری نے میری بھی بے عزتی
 کر دی اور کہا کہ آئندہ میرے گھر نہ آنا۔ میں نے وہاں جانا چھوڑ دیا۔“

”علی رضا نے کوئی دھمکی دی تھی؟“
 ”کہتا تھا بے عزتی کا انتقام لوں گا۔“ سلتو نے جواب دیا۔ ”یہ تو

ردوں کی عادت ہے۔ کسی عورت سے جو تے کھا کر یہ تو ضرور ہی کہتے
 ہیں کہ بے عزتی کا بدلہ لوں گا لیکن وہ راستہ ہی چھوڑ دیتے ہیں جس پر

اُس عورت کو دیکھ لیتے ہیں۔

”سُلو! ایک بات اچھی طرح سن لو۔“ میں نے اُسے کہا۔ ”مجھے تم پہلی بار دیکھ رہی ہو کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔ اگر شکوری کو علی رضا نے اغوا کر لیا ہے اور اس میں تمہارا ماتھ بھی ہے تو مجھے ابھی بتا دو۔ اگر بعد میں مجھے تمہارے خلاف کوئی ثبوت مل گیا تو دس سال سے کم سزا نہیں ہوگی شکوری اگر قتل ہوگئی ہے تو عرقید دلاؤں گا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ اس گاؤں میں میرے کتنے مخبر ہیں۔“

اُس نے قسمیں کھانی شروع کر دیں۔ قسموں کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا۔ تھانیداروں کا رعب تو آج بھی ہے لیکن وہ بات نہیں رہی جو میرے وقتوں میں تھی۔ تھانیدار کو دیکھ کر لوگ ایک طرف ہٹ جاتے اور جھک کر سلام کرتے تھے، اور مجھ جیسے جن جنونی اور خطی تھانیداروں کو پھانسی پانی کا لالچ نہیں ہوتا تھا، اُن سے تو لوگ بدکتے اور خوف کھاتے تھے۔ سُلو میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ایک تھانیدار کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتی، پھر بھی میں نے اس عورت کو شک کی نگاہوں سے دیکھا اور اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکالنے کے لئے اُسے بہت کچھ کہا۔ بعض انسانوں کی ڈھیٹ پن کی ہڈی بڑی مضبوط ہوتی ہے۔

”سُلو!“ میں نے اُسے کہا۔ ”میں لڑکی برآمد کر ہی لوں گا۔ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ اس گاؤں میں مخبر ہیں۔ تم پر بھی مخبر لگے ہوتے ہیں۔ میں تمہیں کچھ فائدہ دینا چاہتا ہوں۔ اگر تم کچھ اتاپڑو دوگی تو النام سے تمہاری جھولی بھر دوں گا۔“

”ایک بات کہوں؟“ اُس نے کہا۔ ”آپ شاید اسے جھوٹ کہیں گے۔ شکوری نے علی رضا کی بے عزتی کی تھی اور وہ کہتا تھا کہ بے عزتی کا بدلہ لوں گا۔ شکوری نے میری بھی بے عزتی کی تھی لیکن میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بدلہ لوں گی۔ میں بڑی پانی ہوں سرکاری! لیکن یہ لڑکی شکوری اتنی پاک اور معصوم ہے کہ میرے دل پر بیٹھ گئی ہے۔ میں اُس کی تلاش میں

دن رات ایک کر دوں گی۔“

لڑکی چالاک اور شو باز تھی

میں گاؤں سے کوری سختی لے کر آگیا۔ اتنا سا ہی معلوم ہوا کہ شکوری بڑے صاف ستھرے اور کچے چال چلن کی تھی اور وہ اپنی مرضی سے نہیں گئی۔ سُلو نے مجھے کوئی کارآمد بات بتانے کی بجائے شک میں ڈال دیا۔ شک یہ تھا کہ شکوری کو علی رضا نے اغوا کیا یا کر دیا ہے۔

علی رضا کے لاپتہ ہونے کا کیس اسے۔ ایس۔ آئی کے پاس تھا میں نے تھانے جا کر اسے۔ ایس۔ آئی کو اپنا شک بتایا اور اُسے کہا کہ وہ تفتیش اس شک کے مطابق کرے۔

اسے۔ ایس۔ آئی کے ساتھ باتیں کرتے مجھے خیال آیا کہ وہ عورت کون تھی جس کی کھاتی ہوتی لاش ملی تھی؟ اتنے زیادہ دن گزر گئے تھے کسی طرف سے کسی عورت کے لاپتہ ہونے کی رپورٹ نہیں آتی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ کسی دوسرے تھانے کا کیس ہوگا۔ اس عورت کو کسی اور جگہ قتل کر کے میرے علاقے میں لاش لاکر دبا دی گئی تھی۔

اتنے دن گزر جانے کے باوجود کسی تھانے سے اطلاع نہیں آتی تھی کہ اس محلے اور اتنی عمر کی ایک عورت لاپتہ ہے۔ میرے پاس اس عورت کے کپڑوں کا ایک ٹکڑا اور اُس کی جوتی تھی جو میں نے ضرورت کے وقت کے لئے رکھی ہوئی تھی۔ ایسی اشیاء باقاعدہ ریکارڈ میں لکھی جاتی اور محفوظ رکھی جاتی ہیں کیونکہ عدالت میں پیش کرنی ہوتی ہیں۔

دو تین دن اور گزر گئے۔ میرے پاس دوسرے کیس بھی تھے۔ کیسوں کے علاوہ بھی کام تھے۔ میں بُری طرح مصروف رہا۔

ایک روز سُلو نمبر دار کے ساتھ تھانے آگئی۔ وہ ایک خبر لاتی تھی۔ اُس نے معمولی سے ایک کسان کی جوان اور غیر شادی شدہ بیٹی کی

انگلی میں ایک انگوٹھی دیکھی تھی جو اُس کی منہیں ہو سکتی تھی۔ سَلُو کہتی تھی کہ یہ انگوٹھی شکوری کی ہے۔

انگوٹھی کی بات کرنے سے پہلے ایک ضروری بات بتا دیتا ہوں۔ اُس زمانے میں دیہات میں انگوٹھیاں ایک ہی ڈیزائن کی ہوتی تھیں۔ ان میں لال رنگ کا نقلی اور چکدار پتھر جڑا ہوا ہوتا تھا۔ باقی زیورات کا بھی ڈیزائن ایک جیسا ہوتا تھا۔ اُس وقت لوگ زیورات کے ڈیزائن نہیں وزن دیکھا کرتے تھے اور یہ کہ سونا خالص ہو، یعنی پاسا ہو، پاؤنڈ پاسا نہ ہو، منگنی پر انگوٹھی دی جاتی تھی تو لڑکی والے یہ نہیں کہتے تھے کہ لڑکے والوں نے بڑے خوبصورت ڈیزائن کی انگوٹھی دی ہے، بلکہ کہتے تھے کہ اتنے وزن کی انگوٹھی دی ہے۔ شہروں میں اتنے ڈیزائن رائج ہو گئے تھے جن میں کشتی نما ڈیزائن زیادہ مقبول ہوا تھا۔ اس میں انگوٹھی کا اوپر کا حصہ کشتی کی شکل کا اور جالی دار بنایا جاتا تھا۔ بعض میں چھوٹے چھوٹے نگہ بھی جڑے جاتے تھے۔

سَلُو نے کسان کی بیٹی کی انگلی میں یہ انگوٹھی دیکھی تھی۔ سَلُو کو معلوم تھا کہ شکوری کی منگنی پر لڑکے والوں نے اُسے یہی یا اس قسم کی انگوٹھی پہنائی تھی۔ یہ شہری ڈیزائن تھا جو گاؤں میں اس لئے آگیا تھا کہ شکوری کا منگیتر فوجی تھا اور بڑی بڑی چھاونیوں میں رہتا تھا۔ یہ انگوٹھی اُس نے شہر سے بنوائی تھی۔ ایسی انگوٹھی ایک غریب کسان کی بیٹی کے پاس منہیں ہو سکتی تھی کیونکہ وہ غریب لوگ تھے اور اس لڑکی کی منگنی بھی منہیں ہوتی تھی کہ اُسے لڑکے والوں کی طرف سے انگوٹھی ملتی۔ اگر ملتی بھی تو انگوٹھی اس ڈیزائن کی نہ ہوتی۔

سَلُو نے شکورہ نمبر دار کو بتایا۔ نمبر دار نے اُسے کہا کہ اس لڑکی کو کسی بہانے شکوری کی ماں کے پاس یا اُس کے منگیتر کے گھر لے جاتے اور انہیں پہلے بتا دے کہ وہ اس لڑکی کو کیوں لارہی ہے۔ سَلُو کو شکوری نے اپنے گھر آنے سے منع کر رکھا تھا۔ اب شکوری گھر منہیں بھی سَلُو نے

شکوری کی ماں اور شکوری کے منگیتر کی ماں کو پہلے ہی بتا دیا کہ وہ ایک لڑکی کو اپنے ساتھ لاتے گی۔ اس کی انگلی میں انگوٹھی ہے۔ سَلُو نے انہیں کہا کہ اگر وہ انگوٹھی پہچان لیں تو خاموش رہیں۔

اس لڑکی کو کہیں لے جانا سَلُو کے لئے مشکل نہ تھا۔ لڑکی خوبصورت تھی۔ اُس کے جسم کی ساخت اور قد کاٹھ میں کشش تھی۔ وہ شادی سے پہلے ہی خراب ہو گئی تھی۔ بہت تیز اور چالاک لڑکی تھی مردوں کو انگلیوں پر بٹاتی تھی۔ اُس کے ماں باپ اور ایک بھائی اس سے تنگ آ گئے تھے۔ لڑکی کسی کو پلے نہیں باہنتی تھی لیکن شوباز تھی۔ ان عادتوں کی وجہ سے اُس کے رشتے کے لئے کوئی نہیں آتا تھا۔

شکر نمبر دار کی ترکیب کامیاب رہی۔ باقی محال سَلُو نے کر دکھایا۔ وہ لڑکی کو دونوں گھروں میں لے گئی اور دونوں ماؤں نے انگوٹھی پہچان لی۔ اتفاق یہ ہوا کہ یہ انگوٹھی شکوری کی انگلی میں ذرا کھلی تھی۔ یہ فرق اس طرح پورا کیا گیا کہ اس کے اُس حصے پر جو باریک ہوتا ہے، تھوڑا سا دھاگہ پیٹ دیا گیا تھا۔ یہ دھاگہ ابھی تک لپٹا ہوا تھا کیوں اس لڑکی کی انگلی میں بھی یہ انگوٹھی کھلی تھی۔ اس لڑکی نے عادت کے مطابق دونوں گھروں میں انگوٹھی خاص طور پر دکھائی تھی۔

نمبر دار نے بھی اس لڑکی کے متعلق مجھے کچھ باتیں بتائیں۔ میں نے نمبر دار اور سَلُو کو یہ کہہ کر گاؤں چلے جانے کو کہا کہ میں آ رہا ہوں۔

میرے ساتھ پلنگ پر بیٹھ گئی

میں دو کائینبلوں کے ساتھ گاؤں میں پہنچا تو نمبر دار میرے انتظار

میں کھڑا تھا۔ میں اُس کے ساتھ چوہاں پر چلا گیا۔ نمبر دار سے کہا کہ وہ انگوٹھی والی لڑکی کو ساتھ لے آئے لیکن انگوٹھی اُس کی انگلی میں ہو۔ میں کچھ سوچ کر اُس کے گھر منہیں گیا تھا۔

پندرہ منٹ کے اندر اندر لڑکی آگئی۔ نمبر دار میرے پاس کیلا آیا۔ وہ ابھی میرے کمرے کے دروازے سے واقف نہیں تھا۔ کچھ مجھے خوش کرنے کے لئے اور کچھ لڑکی کو دھوکے میں رکھنے کے لئے اس نے ایک ڈھنگ کھیلا۔ ”ملک حضور!“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”ہیروں میں ہیرو ہے۔۔۔ میں نے جوجی (لڑکی) سے کہا کہ بڑا امتحانیدار تیری خواہش کرتا ہے۔ اس کی باچھیں کھل گئیں لیکن اپنا جہم رکھنے کے لئے بولی کہ میں ایسی نہیں۔ میں نے کہا کہ تو جیسی بھی ہے، وہ تجھے چاہتا ہے۔۔۔ بس، آگئی ساتھ آگئی۔ اس کی انگلی میں ہے۔“

میں بھی جواب میں مسکرایا اور اسے کہا کہ لڑکی کو اندر بھیج دے۔ نمبر دار گیا اور لڑکی آگئی۔ وہ اس سے زیادہ خوبصورت تھی جتنا مجھے بتایا گیا تھا۔

وہ غریب باپ کی بیٹی لگتی ہی نہیں تھی۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا۔ وہ بہانے خصوصاً عورتوں میں فرسٹ پریٹیٹا کرتی تھیں۔ امتحانیدار کے برابر بیٹھنے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن یہ لڑکی میرے ساتھ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور وہ شرمانے کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔

میں نے اس کا وہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا جس کی انگلی میں انگوٹھی تھی۔ وہ میرے قریب سرک آئی۔ میں نے حیرت کا اظہار کیا اور کہا کہ اس نے اتنی قیمتی انگوٹھی پہن رکھی ہے۔ وہ اور زیادہ پھیل گئی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کھوکھلے کردار کی لڑکی ہے۔ اس کی عمر اٹھارہ انیس سال ہو سکتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس لڑکی کا انجام کیا ہوگا۔ اپنی برادری اور گاؤں میں اس کا رشتہ کسی نے قبول نہیں کرنا تھا کیونکہ وہ بدنام ہو چکی تھی۔ ایسی لڑکیوں کی شادیاں اس طرح ہوا کرتی تھیں (اب بھی ایسے ہی ہوتی ہیں) کہ گاؤں کے بڑے چوہدری صاحب کسی غریب کے بیٹے کو حکم دیتے تھے کہ فلاں لڑکی کے ساتھ شادی کر لے۔ شادی کر کے وہ لڑکی کو اپنی خدمت

کے لئے استعمال کرتے رہتے تھے۔ جوجی جیسی لڑکیوں کے لئے ایک راستہ اور ہوتا تھا۔ یہ تنہا کسی برہمن فروش کے جال میں آکر گھر سے اس کے ساتھ بھاگ جانا اور فروخت ہو جانا۔ ایسی لڑکیاں نوابوں کو رشوت کے طور پر پیش کی جاتی تھیں اور آخر ان کی منزل عصمت فروشی ہوتی تھی۔ جوجی تو خاص طور پر خوبصورت اور پمپش لڑکی تھی۔ اس نے اپنا آپ مجھے پیش کر دیا تھا۔ یہ میں ہی جانتا ہوں کہ اتنے اشتعال انگیز خشن کے آگے اپنے کردار کو فاقم رکھنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ لذت تو گناہ میں بھی ہوتی ہے لیکن گناہ کے جال میں جا کر اپنے آپ کو بچالانے میں جو لذت ہوتی ہے وہ رُوح کو سرشار کر دیتی ہے۔

”جوجی!“ میں نے بناوٹی جذباتی لہجے میں پوچھا۔ ”یہ انگوٹھی کہاں سے لاتی ہو؟ بہت پیاری انگوٹھی ہے۔ تمہاری انگلی میں تو یہ اور زیادہ اچھی لگتی ہے۔ یہ میگزین کی طرف سے آتی ہوگی!“

”میرے بھائی نے مجھے شہر سے لاکر دی ہے۔“ اس نے شرما کر جواب دیا۔ ”میری ابھی منگنی نہیں ہوئی۔“

”جھوٹ نہ بولو جوجی!“ میں نے بڑے پیار سے لہجے میں کہا۔ ”میں نہیں اس سے زیادہ خوبصورت اور قیمتی انگوٹھی لا دوں گا۔۔۔ دیکھو جوجی! امیر اول نہ توڑو۔ میں نے تمہیں گاؤں میں دیکھا تھا۔ تم نے تو میری نیند حرام کر دی ہے۔ میں نے نمبر دار سے کہا کہ اس لڑکی کو میں ساری عمر اپنے سینے سے لگا کر رکھوں گا۔ میں اپنی امتحانیداری اور اپنا مال دولت اس لڑکی کے قدموں میں رکھ دوں گا۔“

لڑکی سرک کر میرے ساتھ لگ گئی۔ میں محسوس کر رہا تھا وہ غبارے کی طرح پھولتی جا رہی تھی۔

”لعلنت بھیجو اس آدمی پر جس نے تمہیں یہ انگوٹھی دی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

اُس نے پھر اپنے بھائی کا نام لیا اور کہنے لگی — ”آپ کو اس سے کیا؟
دفع کرو، جس کسی نے بھی دی ہے۔“

”میں جانتا ہوں جو جی، تمہارے کتنے دوست ہیں۔“ میں نے دوستانہ
لہجے میں کہا — ”اگر جھوٹ بولو گی تو میں تمہیں دوست نہیں بناؤں گا۔“

اس طرح میں نے کچھ دیر بچوں جیسی باتیں کیں۔ آخر اُس نے گاؤں
کے ایک آدمی کا نام لیا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے یہ بھی بتا دیا کہ کتنے روز پہلے
اس آدمی نے اُسے یہ انگوٹھی دی تھی۔

میں نے حساب لگایا۔ اس آدمی نے اُسے یہ انگوٹھی شکوری کے لاپتہ
ہونے کے سات آٹھ روز بعد دی تھی۔ میں نے جو جی سے انگوٹھی کے متعلق
ہی کچھ اور باتیں پوچھیں اور میرا ہوجی بخیدہ ہوتا گیا تو جو جی کے چہرے پر
پریشانی نظر آنے لگی۔

”آپ کوئی اور بات کیوں نہیں کرتے؟“ اُس نے کہا — ”میں آپ
کے ساتھ....“

”سنو جو جی؟“ میں نے ظاہری پیار سے اُس کا گال تھپکا کر کہا۔
”میں تمہارے ساتھ دوسری باتیں بھی کروں گا۔ پیار کی باتیں کروں گا۔ تم
لے میرے دل پر قبضہ کر لیا ہے لیکن ایسی بات سامنے آگئی ہے کہ میں
تمہیں اس سے بچانا چاہتا ہوں۔ مجھے اس انگوٹھی کے متعلق سچ بتا دو۔“

”بتا تو دیا ہے۔“ اُس نے کہا — ”میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ یہ
انگوٹھی مجھے نصیر نے دی ہے۔ اُس کا نام نصیر ہے لیکن سب اُسے حوالدار
کہتے ہیں۔ میں نے آپ کو یہ بھی بتا دیا ہے کہ اُس کے ساتھ میرا تعلق کیسا
ہے۔ آپ کہیں گے تو میں اُس کے ساتھ دوستی توڑ دوں گی۔“

”یہ انگوٹھی چوری کی ہے جو جی؟“ میں نے کہا — ”یہ شکوری کی
انگوٹھی ہے۔“

”وہ شکوری جو کہیں چلی گئی ہے؟“ جو جی نے کہا — ”وہ تو قتل ہو گئی
ہے۔ اُسے دفن بھی کر دیا گیا ہے۔“

”اُسے چھوڑ اُسے کیا ہوا ہے۔“ میں نے کہا — ”مجھے یہ بتاؤ کہ یہ
انگوٹھی تم نے چوری کی ہے؟ اگر تم نے کی ہے تو مجھے ابھی بتا دو۔ میں تمہیں
بچاؤں گا۔“

اُس نے قہقہے کھاتیں اور کہا کہ اُس نے چوری نہیں کی اور نصیر
کو بلا کر اُس کے سامنے پوچھا جاتے۔

”صرف ایک بات آپ کو نہیں بتاتی۔“ اُس نے کہا — ”نصیر نے
مجھے کہا تھا کہ ایک امیر کبیر آدمی نے مجھے دیکھا تھا۔ وہ میرے ساتھ شادی
کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ شہر میں رہتا ہے۔ میں نے اُسے
کہا تھا کہ مجھے وہ آدمی دکھا دو، کوئی بوڑھا یا بد صورت ہی نہ ہو۔ نصیر نے
ایک روز بعد مجھے کہا کہ آج عصر کی اذان ہو تو کسی یہاں قبرستان میں
اُجھانا اور وہ آدمی اُس کے ساتھ ہوگا....“

”میں قبرستان میں گئی اور اُس آدمی کو نصیر کے ساتھ دیکھا۔ انہوں
نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ بات کوئی نہ ہوئی۔ وہ آدمی میرے دل کو بہت
اچھا لگا۔ نصیر نے مجھے کہا کہ چلی جاؤ۔ میں آگئی اور دوسرے دن نصیر نے
مجھے یہ انگوٹھی دی اور کہا کہ اسے منگنی کی انگوٹھی سمجھو۔ مجھے اب نصیر کی
مدد سے اس آدمی کے پاس چلے جانا تھا لیکن نصیر کہتا تھا کہ وہ آدمی کچھ
دلوں بعد بتاتے گا کہ میں کب گھر سے نکلوں۔“

”میری بات غور سے سنو جو جی؟“ میں نے اُسے کہا — ”تمہارے
ساتھ دھوکہ ہو رہا ہے۔ اگر نصیر کی نیت صاف ہوتی تو سیدھا طریقہ یہ تھا کہ وہ
اُس آدمی کے لئے تمہارے ماں باپ سے تمہارا رشتہ مانگتا لیکن اُس نے
پہلے خود تمہارے ساتھ ناجائز تعلق رکھا اور تمہیں چوری کی انگوٹھی دے کر
کہہ دیا کہ اُس آدمی نے دی ہے جس کے ساتھ تمہاری ملاقات قبرستان میں
ہوتی تھی۔ وہ آدمی تم جیسی لڑکیوں کا سوداگر ہوگا.... کیا تم فروخت ہونا
چاہتی ہو؟ چلے میں بیٹھنا چاہتی ہو؟“

میں نے اُس کا چہرہ دیکھا۔ خوف کا تاثر بڑا صاف تھا۔ اُسے ڈرانے

کی اور اُس کے ساتھ زبان کی ہیرا پھیری کرنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی۔ چوری کی انگوٹھی پکڑی گئی تھی۔ اُس نے اُس آدمی کی نشاندہی کر دی تھی جس نے اُسے انگوٹھی دی تھی۔ مجھے اب ضرورت نہیں تھی کہ اس لڑکی کی چال بازی کرتا لیکن میں نے یہ سوچ کر کہ اس لڑکی کو عدالت میں بھی پیش کرنا ہے۔ اس کے ساتھ پیار محبت جاری رکھا۔

میں نے انگوٹھی کی برآمدگی کا قانون قاعدے کے مطابق کرنے کے لئے گاؤں کے دو معززین بلائے اور ان کی موجودگی میں جو جی کا بیان تحریر کیا۔ اُس نے میرے کہنے پر انگوٹھی اتار کر میرے حوالے کر دی۔ اُس کے بیان پر معززین کے دستخط کرائے اور جو جی کو اپنے ہیڈ کانسٹیبل کے حوالے کر دیا۔ میں نے اُسے تسلی دی کہ وہ گھبراتے نہیں۔

نمبر دار سے کہا کہ ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے جاتے اور نصیر عرف حوالدار کو لے آتے۔

قبرستان میں ملاقات منگنی کی انگوٹھی

پندرہ بیس منٹ بعد نصیر عرف حوالدار میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اسے بلانے سے پہلے میں نے نمبر دار سے اُس کے متعلق پوچھ لیا تھا۔ نصیر کے خاندان کی اپنی زمین تھی اور نصیر پر معاشوں کی منڈی میں جا بیٹھا تھا۔ وہ ابھی تک کسی واردات میں گرفتار نہیں ہوا تھا۔ گاؤں سے ہفتہ دس روز کے لئے غائب بھی ہو جاتا تھا۔ اُدنی قسم کا جو تے باز تھا۔ گاؤں میں ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ پیار محبت اور احترام سے پیش آتا تھا۔ نمبر دار کو یہ بھی معلوم تھا کہ جو جی کے ساتھ اُس کے تعلقات ہیں۔

”نصیر دوست!“ میں نے اُسے کہا۔ ”ذرا سی بھی ہیرا پھیری نہیں چلے گی۔ یہ سوچ کر جھوٹ بولنا کہ میں بھل داس نہیں ہوں۔ تم جو بات بعد میں اگل ہی دو گے وہ ابھی بتاؤ۔ دو۔ نہیں بتاؤ گے تو کل اس

وقت تک تمہاری یہ حالت ہو جائے گی کہ تمہارے اس گاؤں کا کوئی آدمی تمہیں پہچان نہیں سکے گا۔“

”معلوم نہیں میرے متعلق شکر و اس نے آپ کو کیا بتایا ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ مجھ پر کیا الزام لگا رہے ہیں۔“

”الزام سن لو اور میرے ساتھ دوستوں کی طرح بات کرو۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے جو انگوٹھی جو جی کو دی ہے وہ چوری کی ہے اور یہ کوئی معمولی چوری نہیں۔ یہ اُس لڑکی کی انگوٹھی ہے جو لاپتہ ہے۔ اُسے زبردستی اغوا کیا گیا ہے اور شاید اُسے قتل بھی کر دیا گیا ہے۔ اُس کے اغوا میں تم بھی شامل ہو۔ مجھے بتاؤ کہ تم کس طرح بے گناہ ہو۔“

وہ آنکھیں پھاڑ کر میرے مُنہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کا مُنہ بھی کھل گیا۔

”پولیس کے ہاتھ میں تم پہلی بار آتے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”فوراً اگل دو گے تو فائدے میں رہو گے۔ میں تمہیں زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دوں گا۔ فوراً جواب دو۔“

”مجھے معلوم ہے کہ علیم الدین کی بیٹی لاپتہ ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”لیکن میرا اُس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔“

”لاپتہ لڑکی کی انگوٹھی تمہارے پاس کس طرح آئی؟“

وہ چُپ رہا۔

”میں تمہیں ہتھکڑی لگا رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ادھتھانے چل کر پوچھوں گا۔“

”گاؤں میں میری عزت ہے حضور!“ اُس نے کہا۔ ”میں نے کسی کو اغوا نہیں کیا۔ مجھے ہتھکڑی نہ لگائیں، سنا نے لے چلیں۔“

وہ میرے سامنے فرش پر بیٹھا تھا۔ کندھے پر گردن کے قریب

ایک جگہ ہے۔ وہاں سے کسی کو ہاتھ سے پکڑ لو تو وہ تڑپنے لگتا ہے۔ درد ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ میں نے نصیر کی وہ جگہ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ وہ تندرست جوان تھا لیکن مجھ میں اتنی طاقت تھی کہ میں اُسے ایک ہاتھ سے اٹھا سکتا تھا۔ وہ ذبح ہوتے بچرے کی طرح تڑپنے لگا۔ اُس نے سر اُدھر اُدھر مارا تو اُس کی پگڑی گر پڑی۔ میں نے اُس کے بال مٹھی میں لے کر اُوپر کو کھینچے تو وہ سیدھا اُوپر کو اُٹھا۔ میں نے پیچھے کو جھٹکا دے کر اُس کے بال چھوڑ دیئے۔ وہ دیوار سے ٹکرایا اور گر پڑا۔

”میں انگوٹھی کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے اُسے کہا۔ ”تمہاری اصل خاطر تو اہم تھا نے میں ہوگی۔“

”بتانا ہوں حضور؟“ اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن حضور، میں صرف انگوٹھی کے متعلق بتا سکتا ہوں۔ یہ مجھے ایک دوست نے دی تھی۔ اُس کا نام عبدالواحد ہے۔“

”کون ہے وہ؟ کہاں رہتا ہے؟... پوری بات سناؤ۔“

اُس نے ایک گاؤں کا نام لے کر بتایا کہ عبدالواحد وہاں کا رہنے والا ہے۔ نصیر بات رُک رُک کر کرتا تھا جیسے پوری بات سُنانے سے ڈرتا ہو۔ میں نے جرح سے، ڈانٹ ڈپٹ اور اپنے طریقوں سے اُس سے ساری بات انگوٹھی۔

اُس کے بیان کے مطابق، عبدالواحد عرف واحدی بردہ فروشوں کے گروہ کا ایک اہم فرد تھا۔ خبر بد تھا اور زبان کا بڑا میٹھا بلکہ اُستاد تھا۔ شہر میں کبھی اُس کی اور نصیر کی ملاقات ہوتی تھی۔ اس کے بعد ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ اکٹھے جوا بھی کھیلے اور طوائفوں کے ہاں بھی اکٹھے جاتے رہے۔ واحدی نے نصیر کو بعد میں جب ان کی دوستی ختم ہو گئی، بتایا کہ وہ بردہ فروش ہے۔ اگر کوئی خوبصورت لڑکی ہاتھ آجاتے جو گھر سے بھاگنے کے لئے تیار ہو تو نصیر واحدی کو بتاتے۔ اگر نصیر اس لڑکی کو واحدی تک پہنچا دے تو اُسے بہت پیسے ملیں گے۔

نصیر نے جو جی کے ساتھ دوستی کر لی تھی۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے تھے۔ نصیر نے سوچا کہ جو جی ہر لحاظ سے بردہ فروشوں کا مال ہے۔ اُس نے واحدی کو بتایا۔ واحدی نے قبرستان میں جو جی کو دیکھا۔ جو جی واحدی کو پسند آگئی۔ واحدی نے نصیر سے کہا تھا کہ وہ جو جی کو یہ جھانسنے دے کہ ایک امیر زادے نے اُسے پسند کر لیا ہے اور وہ اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔

واحدی نے جو جی کو دیکھا اور یہ انگوٹھی نصیر کو دی کہ وہ انگوٹھی جو جی کو دے کہ کہ یہ رنگینی کی انگوٹھی ہے نصیر نے انگوٹھی جو جی کو دے دی۔ نصیر کو معلوم نہیں تھا کہ انگوٹھی شکوری کی ہے۔

اگر نصیر کا یہ بیان سچا تھا تو شکوری کو واحدی کے گروہ نے اغوا کیا تھا۔ اگر شکوری بردہ فروشوں کے ہاتھ لگ گئی تھی تو اتنے دنوں میں کسی نواب کے حرم یا اعلیٰ درجے کی طوائفوں کی دنیا میں پہنچ چکی ہوگی۔ مجھے نصیر پر بھی شک تھا۔ شکوری کے اغوا میں اس کا ہاتھ ضرور ہوگا۔

میں نے نصیر کو ہتھکڑی لگالی۔

ایک کارروائی اور باقی تھی۔ انگوٹھی کے مالکوں سے انگوٹھی کی شناخت کرانی تھی۔ میں نے شکوری کے ماں باپ اور اُس کے منگیتر کے ماں باپ کو بلایا۔ ہر ایک کو باری باری اندر بلایا اور دو گواہوں کے سامنے اُن سے انگوٹھی کی شناخت کرائی اور ان کے بیان ملتے، پھر میں نصیر اور جو جی کو ساتھ لے کر تھانے چلا گیا۔

انگوٹھی کیسے اُترے؟

نصیر نے واحدی کا جو گاؤں بتایا تھا وہ ساتھ والے تھانے کے علاقے میں تھا۔ میں اگلی صبح روانہ ہو گیا۔ وہاں کے تھانے کا انچارج والا بابو کے قریب کارہنہ والا ایک مسلمان سب انسپکٹر معین الدین خان تھا۔

اُس سے جا ملا اور بتایا کہ مجھے اُس کے تھانے کا عبد الواحد عرف واحدی مطلوب ہے۔ وہ گاؤں دراصل قصبہ تھا۔ تھانہ وہیں تھا۔ میں نے معین الدین کو بتایا کہ یہ شخص مجھے کیوں مطلوب ہے۔

”تم اُسے جانتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”سو نے کے اٹھ سے دیتا ہے۔“ سب انسپکٹر معین الدین نے آنکھ

مار کر کہا۔ ”اُستاد ہے۔ میں جانتا ہوں یہی اُس کا کسب ہے۔“

معین الدین کو میں پہلے سے جانتا تھا۔ اُس نے مجھے بے تکلفی سے بتایا کہ واحدی بردہ فرشل کا ایک آدمی ہے لیکن اس کا گروہ جبری اغوا کی وارداتیں کم ہی کرتا ہے۔ لڑکیوں کو محبت کا جھاندر دے کر اور درغلا کر اُن کی مرضی سے گھروں سے بھگا لے جاتا ہے۔ جوجی جیسی بعض لڑکیاں بھاگنے کے لئے تیار رہتی ہیں۔ واحدی اپنے علاقے کے تھانیدار کے ساتھ گہری دوستی رکھتا تھا اور تھانے میں نذر نیا نہ بھجاتا رہتا تھا۔

معین الدین نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی کہ میں واحدی کو نہ پکڑوں۔ میں نے اُسے بتایا کہ کیس کن نوعیت کا ہے اور یہ کیس دبایا نہیں جاسکتا۔ مختصر یہ کہ میں واحدی تک پہنچ گیا۔ وہ مجھے گھڑی مل گیا تھا۔ میں نے انگوٹھی کی بات کی تو اُس نے حیرت کا اظہار کر کے کہا کہ آپ کو ن ہی انگوٹھی کی بات کر رہے ہیں؟ اُس نے یہ بھی کہا کہ وہ کسی نصیر عرف حوالدار کو نہیں جانتا۔

اگر وہ ہیرا پھیرتی نہ کرتا تو میں اُسے ذرا عزت سے اپنے ساتھ لاتا لیکن اُس کا سلوک دیکھ کر میں نے اُسے ہتھکڑی لگالی۔

میں انیس میل کا فاصلہ تھا۔ ہم لاری پر واپس آتے۔ راستے میں وہ مجھے رشوت پیش کرتا اور رقم بڑھاتا رہا۔ میں نے اُسے کہا کہ میرے پاس اُس کے خلاف اتنی شہادت اکٹھی ہو گئی ہے کہ میں اُسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا۔ میں اُس سے پوچھتا تھا کہ اُسے انگوٹھی کہاں سے ملی تھی۔ وہ نہیں بتاتا تھا کہ کتنا تھا کہ اُس نے کسی کو کوئی انگوٹھی نہیں دی۔

اپنے تھانے پہنچے تو میں نے جوجی کو اُس کے سامنے کھڑا کر کے پوچھا کہ یہی وہ آدمی تھا جسے اُس نے قبرستان میں دیکھا تھا؟ پھر واحدی کو میں نے حوالات کے دروازے پر جا کھڑا کیا اور نصیر سے پوچھا کہ یہی ہے نا واحدی؟ نصیر نے جواب دیا کہ یہی ہے۔

”واحدی!“ میں نے اپنے دفتر میں بٹھا کر اُسے کہا۔ ”میرے صرف دو گواہ ہیں۔ دوسرے گواہوں کو تم کو رٹ میں دیکھو گے۔ اُس وقت کیس میرے ہاتھ سے نکل چکا ہو گا۔“ حقیقت یہ تھی کہ میرے پاس اور کوئی گواہ نہ تھا۔ میں نے اُسے کہا۔ ”عدالت میں میرے گواہوں اور شہادت سے اپنا جرم ثابت کرنا چاہتے ہو تو ساری عمر جیل سے نہیں نکل سکو گے۔ یہاں تھانے میں تمہارے ساتھ جو سلوک ہو گا وہ شاید تم جانتے ہو گے۔ میں زیادہ باتیں نہیں کروں گا۔ ابھی دو کانٹیلوں کے حوالے کر دوں گا، پھر تم میرے پاؤں پکڑ کر بیان دو گے تو بھی میں بیان نہیں لوں گا....“

”شکوری کہاں ہے؟“

اُس نے میرے مُنہ کی طرف دیکھا۔

”شکوری کی لاش کہاں ہے؟“ میں نے اُسے ڈرانے کے لئے

کہا۔ ”تم قتل کے ملزم ہو۔“

اُس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن مُسکرا نہ سکا۔

”تم مجھے رشوت کیوں پیش کر رہے تھے؟“

”وہ تو میں اب بھی پیش کرتا ہوں۔“ اُس نے کہا۔

”جرم کیا ہے تمہارا؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم تو بے گناہ ہو، پھر

رشوت کیسی؟“

میں نے کئی تیر ہوا میں چلائے۔ شاید ان میں سے ایک دو نشانے پر جا لگے۔ میں اب اُسے بار بار قتل کا ملزم کہتا تھا۔ گناہ انسان کے اندر بولتا ہے۔ وہ پریشان ہو کر بول پڑا۔

”عدالتی قسم!“ اُس نے کہا۔ ”میں نے کسی لڑکی کو اغوا نہیں

کیا نہ اعتراف کر رہا ہے۔ میں نے وہ لڑکی ایک ساڈھو سے خریدی تھی۔ لڑکی کے کانوں میں جھمکے تھے۔ وہ ساڈھو نے اُتار لیتے تھے اور انگوٹھی میں نے اُتار لی تھی۔“

”لڑکی کہاں ہے؟“

”وہ مجھ سے چھین گئی تھی۔“ اُس نے کہا۔ ”آپ مجھ پر رحم کریں۔ میں نے لڑکی ساڈھو سے خریدی اور اُسے رقم دے دی تھی۔ راستے میں چار آدمی مجھ سے لڑکی چھین کر لے گئے۔ رقم بھی لٹی لڑکی بھی گئی۔“

”ساڈھو کہاں ملا تھا؟“ میں نے کہا۔ ”وہ لڑکی کہاں سے لایا تھا؟“

”کہتا تھا کہ لڑکی اُس کے جادو کے اثر سے اُس تک پہنچی ہے۔“

واحدی نے کہا۔ ”وہ غلط نہیں کہتا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ لڑکی اُس کے پاس چُپ چاپ بیٹھی تھی۔ رات کا وقت تھا۔ میں ویسے ہی ساڈھو کے ہاں چلا گیا تھا۔ لڑکی کو دیکھا۔ سودا ہوا۔ میں نے رقم دی۔ اُس نے لڑکی سے کہا کہ اس کے ساتھ چلی جاؤ۔ وہ اُٹھی اور میرے ساتھ چل پڑی۔ راستے

میں چار آدمی مل گئے۔ اُنہوں نے مجھے مارا پیٹا۔ ایک نے لڑکی کا بازو پکڑا تو وہ ان آدمیوں کے ساتھ چل پڑی۔“

میری ہنسی نکل گئی۔ ذرا اس کے بیان پر غور کریں۔ لڑکی جادو کے زور سے ساڈھو تک پہنچی پھر جس کسی نے لڑکی کا بازو پکڑا، وہ اُس کے ساتھ چل پڑی۔ اس بیان سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ شخص تجربہ کار جراتم پیشہ ہے۔ اس نے مجھے اُتو بنانے کے لئے کیسی عجیب کہانی گھڑ لی تھی۔

”واحدی!..... اوتے واحدی؟“ میں نے کہا۔ ”جس جال میں تم آ گئے ہو، اس سے جھوٹ بول کر تم نہیں نکل سکو گے۔... بروہ فردوشی تمہارا پیشہ ہے نا؟“

اُس نے سر ہلایا کہ ہاں، یہ اُس کا پیشہ ہے۔

”میں جھوٹ نہیں بول رہا جناب!“ اُس نے کہا۔ ”میں اُس

ساڈھو کی نشاندہی کر رہا ہوں۔ آپ تفتیش کریں۔“

”کہاں ہے وہ ساڈھو؟“ میں نے پوچھا۔

جادو جو گف سے چلا

اُس نے جو کہانی مجھے سنائی وہ میں آپ کو اپنی زبان میں اور اپنے انداز سے سناتا ہوں۔

پاکستان میں پیدا ہونے والی نسلوں نے ساڈھو اور سنیا سی نہیں دیکھے۔ یہ بہند وہو کرتے تھے۔ سنیا سی ذرا اچھے لباس اور ٹیلے میں رہتے تھے۔ ان کا لباس عام شہریوں سے الگ تھلک ہوتا تھا۔ وہ جنگلوں میں گھومتے پھرتے اور جڑی بوٹیاں اکٹھی کر کے دوائیاں بناتے تھے۔ انہیں جوگی بھی کہا جاتا تھا۔ ان میں سے بعض جنگل میں ہی لیکن آبادی کے قریب خیمہ لگا کر ڈیرہ ڈال لیتے تھے اور بعض قصبوں اور شہروں میں دکانیں کھول لیتے تھے۔

دوسرے ساڈھو تھے۔ ان کا حال حلیہ فقیروں جیسا ہوتا تھا۔ سر کے بالوں کے ساتھ کالے رنگ کی رسیوں یا موت کے بال چپکاتے رکھتے تھے۔ جسم پر راکھ یا مٹی مل لیتے تھے۔ ان میں بیشتر نیم برہنہ اور کچھ بالکل ننگے رہتے تھے۔ بہند وہن نہیں مقدس سمجھتے تھے۔ تجارت میں اب بھی ناگے ساڈھو، جسم پر گاجنی مٹی کا لپیپ کئے ہوتے یا راکھ ملے ہوتے گلیوں میں گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ بہند وہو میں ان مادر زاد ننگے ساڈھو کو اپنے گھروں میں لے جاتی اور ان کی بہت خاطر تواضع کرتی ہیں۔

یہ تو مسلمانوں میں بھی ہے کہ جو ان عورتیں پیروں اور عاملوں وغیرہ کے ہاں مرادیں پوری کرانے جاتی ہیں اور ان عورتوں کے خاوند اور بھائی اپنے آپ کو یہ فریب دیتے رکھتے ہیں کہ ان کے پیر صاحب اللہ والے ہیں اور ان کی عورتوں کو بُری نظر سے نہیں دیکھتے لیکن بہند وہو کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساڈھو ان کی عورتوں کے ساتھ بدکاری کرتے ہیں اور ان کے

عورتوں کے خاوند اور بھائی وغیرہ خوش ہوتے ہیں۔

میں اپنے وقتوں کی بات سنار ماہوں۔ بعض سادھو آبادی کے قریب کسی قدر قری غاریاں میں رہتے تھے۔ ہندو عورتیں ان کے پاس مڑاویں پوری کرانے جاتی تھیں اور انہیں پیسے دیتی تھیں۔ ان سادھوؤں کے متعلق عجیب و غریب کہانیاں مشہور تھیں۔ اولاد کی خواہشمند عورتیں ان سادھوؤں کی زیادہ معتقد تھیں۔ ہندو کہتے تھے کہ بعض سادھوؤں کے پاس کوئی پڑاسرار طاقت ہوتی ہے۔ یہ تو میں بھی مانتا ہوں کہ بعض سادھو کالے علم میں مہارت رکھتے تھے لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ باقی سب فراڈ تھے۔ ہندو تو ان کے معتقد تھے ہی، بعض مسلمان بھی ان کے پاس جاتے تھے۔

واحدی نے مجھے ایسے ہی ایک سادھو کے متعلق بتایا کہ وہ کالے علم کا ماہر ہے لیکن کسی کسی کا کام کرتا ہے۔ شکوری کے گاؤں سے تقریباً ایک میل دور ایسا علاقہ تھا جہاں چٹانیں اور مٹی کے ٹیلے کھڑے تھے۔ وہ وسیع کھنڈوں اور گھاٹیوں کا علاقہ تھا۔ وہاں ایک لمبی چوڑی گف قدرتی طور پر بنی ہوئی تھی۔ اس میں ایک سادھو نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ اُس کی شہرت یہ تھی کہ آسیب اور سانے کا علاج کرتا تھا اور کہتے تھے کہ کالا علم بھی جانتا ہے۔ لوگ (خصوصاً عورتیں) اُس کی گف میں جاتے اور اُس کے آگے ماتھے گرہاتے رہتے تھے۔ واحدی بھی اُس کے معتقدوں میں تھا۔ ایک رات واحدی پیدل وہاں سے گزرا۔ وہ اپنے کسی کام سے جا رہا تھا۔ گف کے سامنے سے گزرا تو اندر روشنی دیکھی۔ واحدی اندر چلا گیا۔ سادھو کے تین چار چیلے بھی تھے۔ وہ اُس وقت وہاں موجود نہیں تھے شاید گف کے اندر کہیں سوتے ہوئے تھے۔ سادھو بیٹھا تھا اور گف کی دیوار کے ساتھ ایک جوان اور بڑی ہی خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔ واحدی اور سادھو نے آپس میں کچھ باتیں کیں۔ لڑکی جس طرح بیٹھی تھی اُسی طرح بیٹھی رہی جیسے بیت رکھا ہوا ہو۔

سادھو واحدی کو گف سے باہر لے گیا اور اُسے کہا کہ اس لڑکی کو وہ اپنے عمل سے لایا ہے۔ سادھو کو معلوم تھا کہ واحدی عورتوں کی خرید و فروخت کا کام کرتا ہے۔ اُس نے واحدی سے کہا کہ وہ اس لڑکی کی قیمت ادا کر دے اور اسے ساتھ لے جائے۔ واحدی نے جیب میں ہاتھ ڈال تو دو سو روپیہ نکلا۔ سادھو نے اُسے دو ہزار روپیہ کہا۔ اُس وقت کا دو ہزار روپیہ آج کے پچیس ہزار روپے کے برابر تھا۔ واحدی نے سادھو سے کہا کہ وہ دو سو روپیہ رکھ لے، باقی رقم ایک دو روز بعد لے آئے گا۔ سادھو واحدی کو جانتا تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ واحدی اُس کا مرید بنا ہوا ہے اس لئے دھوکہ نہیں دے گا۔ اُس نے واحدی سے کہا کہ وہ لڑکی کو بے فکر ہو کر ساتھ لے جاتے۔ لڑکی کالے علم کے اثر میں تھی۔

اندر جا کر سادھو نے لڑکی سے کہا کہ اس کے ساتھ چلی جاؤ۔ لڑکی کچھ کہنے لگی اور چل پڑی۔ سادھو نے اُسے رکنے کو کہا تو لڑکی رُک گئی۔ سادھو نے لڑکی کے کانوں سے جھکے اُتار لئے۔ کہنے لگا کہ دو ہزار روپیہ لڑکی کا ہے، زلیور میرا ہے۔ وہ انگوٹھی اتارنے لگا تو واحدی نے کہا کہ یہ میرے لئے رہنے دو۔ سادھو نے انگوٹھی نہ اتاری۔ یہ واحدی نے اتار لی۔

”لڑکی میرے ساتھ چل پڑی۔“ واحدی نے مجھے سنایا۔ ”میں نے اُس سے اُس کا نام پوچھا تو وہ چپ رہی۔ اُسے بلایا۔ کندھے پر ہاتھ رکھ کر جھوٹا لیکن وہ نہ بولی۔ میں ڈر گیا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس سادھو کے ہاتھ میں کوئی الٹی طاقت ہے۔ مجھے ڈر یہ لگا کہ یہ کوئی اور چیز ہے، انسان نہیں۔ سادھو نے کہا تھا کہ تقریباً تین گھنٹے اور اس پر یہ اثر رہے گا اور تین گھنٹوں کے اندر اندر اسے کہیں پہنچا دینا۔“

”میں چلتا گیا۔ لڑکی میرے ساتھ پالتو بکری کی طرح چلی جا رہی تھی۔ میں ایک دوست کے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ اچانک کسی نے

مجھے ملکا کر روک لیا۔ میں رکا اور چاقو نکال لیا۔ وہ چار تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ تمہارے ساتھ یہ کون ہے۔ میں نے کہا بیوی ہے۔ چاروں نے لڑکی کو ماچسیں جلا کر دیکھا۔ ایک نے کہا کہ لے چلو۔ میں نے اُن کی ہنست کی۔ میں اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔۔۔

”ان میں سے ایک آدمی نے مجھے غور سے دیکھا اور پوچھا کہ تم واحد؟ تو نہیں ہو؟ میں نے بتایا کہ میں واحدی ہوں تو اُس نے کہا۔ ”لے چلو، لے چلو۔ یہ اس کی بیوی نہیں کہیں سے اڑا لیا ہے۔“ اُس نے مجھے کہیں اس کا روبرو میں دیکھا ہوگا۔ وہ ہم دونوں کو اپنے ساتھ لے گئے لیکن تھوڑی دُور آگے جا کر انہوں نے مجھے مار پیٹ کر بے ہوش کر دیا۔ میں جب ہوش میں آیا تو میں کہیں اور پڑا تھا۔ میں اُٹھا اور اپنے گاؤں کو چلا گیا۔

”تم سادھو کے پاس پھر نہیں گئے؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم نے اُسے بتایا نہیں کہ لڑکی تمہارے ہاتھ سے نکل گئی ہے؟“

”تیسرے یا چوتھے روز گیا تھا۔“ واحدی کے جواب دیا۔ ”وہ چپ رہا تھا۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ دو سو روپیہ مجھے واپس کر دے لیکن اُس نے واپس نہیں کیا۔ اس کے بعد میں سادھو سے نہیں ملا۔“

انگوٹھی کے متعلق اُس نے ویسا ہی بیان دیا جیسا نصیر دے چکا تھا۔ نصیر نے اُسے جو جی دکھائی تھی۔ جو جی پر یہ اثر ڈالنے کے لئے کہ واحدی امیر زادہ یا شہزادہ ہے، واحدی نے جو جی کو دینے کے لئے نصیر کو شکوری کی انگلی سے اتاری ہوئی انگوٹھی دی تھی۔ وہ جو جی کو شادی کا جھانپہرے کرے آگے چلائے کا بندوبست کر چکا تھا۔

وہ چرس کے لئے پاگل ہو گیا

میں نے واحدی کو حوالات میں بند کر دیا اور اس سوچ میں ڈوب

پیر اور عال وغیرہ اسے جڑوں کی کارستانی کہہ کر مظلوم گھرانے سے پیسے بٹورتے ہیں۔ حقیقت میں اس خاندان کا کوئی دشمن کالے علم کا عمل کرنے والے آدمی سے یہ کام کروا رہا ہوتا ہے۔ میں نے اسے ہمیشہ جرم کہا ہے۔ پاکستان میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ دشمن ایک دوسرے کو کالے علم سے جسے جادو اور اُلٹے تعویذ بھی کہتے ہیں، پریشان کرتے ہیں مگر ہمارا قانون خاموش رہتا ہے۔

رات کے نو بجنے والے تھے جب میں تین کانٹیلوں کے ساتھ سادھو کی گف میں داخل ہوا۔ سادھو ایک دیسا منے رکھے بیٹھا تھا۔ اُس کا صرف ایک چیلو وہاں موجود تھا۔ سادھو پولیس کو دیکھ کر گھبرایا لیکن فوراً سنبھل گیا اور جھڑپنے لگا جیسے مراقبے میں چلا گیا ہو۔

”اس وقت ہم نے کسی تھانیدار کو حاضر ہونے کے لئے نہیں کہا تھا۔“ اُس نے مخموری آواز میں کہا۔ ”تم کیوں آگئے ہو؟“

”مہاراج!“ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بلایا اور کہا۔

— ”آپ کے پاس ایک لڑکی کے دو ٹھکے ہوں گے۔ میں وہ لینے آیا ہوں۔“

”کیا بگ رہا ہے تھانیدار؟“ اُس نے شرابیوں کی آواز میں کہا۔

”ہم اس وقت کسی کو جھکے نہیں دے سکتے۔“

میں خطرہ مول لے رہا تھا۔ خطرہ یہ نہیں تھا کہ سادھو مجھ پر جادو کر

دے گا۔ کالاجادو اتنی جلدی نہیں کیا جاسکتا۔ خطرہ یہ تھا کہ ان سادھوؤں کو ہندوؤسی طرح مانتے ہیں جس طرح مسلمان پیروں کو۔ میں نے اپنے ڈی۔ ایس۔ پی سے جو انگریز تھا، ٹیلیفون پر بات کر لی تھی۔ اُس نے مجھے اجازت دے دی تھی کہ ثبوت اور شہادت معقول ہو تو سادھو کو گرفتار کر لو۔

میں نے سادھو سے ایک بار پھر کہا کہ وہ مجھے ٹھیکے دے دے لیکن وہ مراقبے میں رہا اور مجھے جواب نہ دیا۔ میں نے اُسے جھنجھوڑا اور کہا کہ میں اُسے گھسیٹ کر تھانے لے جاؤں گا۔ تب اُس نے میری طرف دیکھا۔ میں اُسے گھسیٹ کر تھانے نہیں لے جاسکتا تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ واحدی نے جھوٹ بولا ہو۔ مجھے تفتیش کرنی تھی جو میں اُس کی گف میں اچھی طرح نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سادھو کو دھکیا دیں اور اُسے اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کر دیا۔

وہ جب اٹھ کر میرے ساتھ چلنے لگا تو اُس نے حلیم کی ٹوپی اور تبا کو کی گتھی اٹھالی، پھر اُس نے چرس کی تین چار گولیاں اور حلیم کی ٹوپی بھی گتھی میں ڈال لی۔ اگر آپ نے پشاور کی اور پوٹھوہاری حقتہ دیکھا ہے تو اس کی ٹوپی بھی دیکھی ہوگی۔ یہ چھوٹی ٹیسی اور لمبوتری ہوتی ہے۔ سادھو اس میں تبا کو ڈال کر اور اس کے نیچے کپڑا لپیٹ کر اس کے نیچے والے سوراخ کے ساتھ منہ لگا کر کش لیتے تھے۔

چرس دیکھ کر مجھے ایک خیال آگیا۔ میں نے سادھو کے ہاتھ سے یہ گتھی لے کر ایک کانٹیلوں کو دے دی۔ راستے میں سادھو میرے ساتھ سادھوؤں کی طرح باتیں کرتا گیا اور میں اُس کے ساتھ مذاق کرتا رہا۔ میں گھوڑی پر بٹھا اور وہ کانٹیلوں کے ساتھ پیدل آ رہا تھا۔ مجھے اُس کے انداز سے شک ہونے لگا تھا کہ یہ شخص سادھو نہیں، اس نے بہر وپ دھار رکھا ہے۔

تھانے پہنچے تو میں نے اُسے حوالات میں بند نہ کیا، کانٹیلوں کے حوالے کر دیا اور اُس کی تبا کو اور چرس والی گتھی اپنے پاس رکھ لی۔ کانٹیلوں

سے یہ کہہ کر کہ اسے ساری رات سونے نہ دیں، میں اپنے گھر چلا گیا۔ میں صبح تھانے میں آیا تو سادھو میری طرف لپکتا تھا لیکن کانٹیلوں اُسے دھکے دے کر پیچھے کر دیتے تھے۔ میں اُس کی طرف توجہ ہی نہیں دے رہا تھا۔ میں اپنے دفتر میں جا بیٹھا۔ ہیڈ کانٹیل نے مجھے بتایا کہ سادھو چرس کے کش کے لئے پاگل ہوتا رہا ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ چرس کانٹیل ہے، اسی لئے میں نے اُس کی گتھی اپنے قبضے میں لے لی تھی۔ نشی ملزم پر تشدد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اُسے نشہ پوراندہ کرنے دو تو نشے کے عرض وہ سب کچھ اگل دیتا ہے۔ میری یہ چال کامیاب رہی۔ سادھو کانٹیلوں سے سگریٹ کے ایک کش کی جھیک مانگتا رہا جو اُسے کسی نے نہ دیا۔ صبح تک اُس کی حالت بہت بُری ہو چکی تھی۔

میں دوسرے کاموں میں لگا رہا۔ دو گھنٹوں کے لئے باہر بھی گیا۔ واپس آکر بھی میں نے سادھو کی طرف توجہ نہ دی۔ مجھے اطلاعیں ملتی رہیں کہ سادھو کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ اُسے کھانا بڑا اچھا کھلا یا گیا۔

شام کا کھانا اُس کے آگے رکھا گیا تو اُس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ وہ چرس کا صرف ایک کش مانگ رہا تھا۔ شام کے بعد اُس نے گالیاں کبھی شروع کر دیں۔ واحدی اور نصیر حوالات میں تھے۔ جو جی کو میں نے انکس رکھا ہوا تھا۔ اُسے ابھی حراست میں نہیں لیا تھا۔ سادھو کی واہی تبا ہی مجھے بھی سناتی دے رہی تھی۔ میں اُسے پوری طرح پاگل کر کے اُس سے پوچھ چکے کہ کرنے کا ارادہ کتنے ہوتے تھا۔

میں سادھو کے متعلق سوچ رہا تھا کہ دو معزز ہندو آگئے۔ میں ایک بات بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ لفظ ”معزز“ کے معنی کچھ اور ہوتے ہیں لیکن میں جب یہ لفظ کسی کے لئے استعمال کرتا ہوں تو یہ پولیس کی اصطلاح ہوتی ہے۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھا کریں کہ میں جسے معزز کہتا ہوں وہ لغات کے معنوں میں یعنی صحیح معنوں میں معزز ہوگا۔ پولیس اُسے معزز کہتی ہے جس کا معاشرے میں کوئی مقام ہو، اُس نے خواہ غنڈے پال

رکے ہوں۔

یہ ہندو جو میرے پاس آئے تھے، وہ منڈی کے سردار تھے۔

روپے پیسے والے تھے اس لئے پولیس کی نظر میں معزز تھے۔ انہوں نے شریفانہ لہجے میں کہا کہ میں نے ایک ساڈھو کو گرفتار کیا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں نے اُسے گرفتار نہیں کیا بلکہ اپنی راہنمائی کے لئے بلایا ہے۔
”آپ کو تو معلوم ہے کہ یہ ساڈھو ہمارے لئے کتنے اونچے رتبے کے لوگ ہوتے ہیں۔“ ایک ہندو نے کہا۔

”شہر کے ہندو ناراض ہو رہے ہیں۔“ دوسرے نے کہا۔

”میں نے ساڈھو مہاراج کو باعزت کام کے لئے بلایا ہے۔“ میں نے جھوٹ بولا اور کہا۔ ”آپ کو اگر اعتراض ہے تو ڈی۔ ایس۔ پی صاحب کے پاس چلے جاتیں۔ یہ کیس ایسا ہے جس کی تفتیش کے لئے مجھے اُن سے احکام مل رہے ہیں۔“

اتنے میں ساڈھو کا واویلا اور ننگی گالیاں سنائی دیں۔ وہ چرس کے نشے سے ٹوٹا ہوا بلند آواز سے وہی تباہی بک رہا تھا۔
”یہ کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے۔“ ایک ہندو نے ہنستے ہوئے کہا۔
”پاگل کو کیوں پکڑ کر رکھا ہے آپ نے؟“ دوسرے ہندو نے پوچھا۔
”یہ آپ کے ساڈھو مہاراج ہیں۔“ میں نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا۔
”چرس مانگ رہا ہے۔ میں اسے چرس نہیں دے سکتا۔ میں اس کی گالیاں صرف اس لئے برداشت کر رہا ہوں کہ آپ لوگوں کی نظروں میں اس کا رتبہ اونچا ہے۔“

دونوں ہندو کھسیانے سے ہو گئے پھر بھی انہوں نے مجھے کہا کہ میں اُن کے مہاراج کو پریشان نہ کروں۔

”میں آپ سے پھر کہتا ہوں کہ اس ساڈھو کے متعلق کوئی بھی بات کرنی ہو وہ ڈی۔ ایس۔ پی صاحب سے کریں۔“ میں نے کہا۔ ”میں حکم کا پابند ہوں۔۔۔ اور میں آپ کو یہ بھی بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں قانون

کے معاملے میں اپنے مذہب کی بھی پرواہ نہیں کیا کرتا۔ اگر کسی ہندو کی بیٹی کے اغوا میں مسجد کا مولوی یا کوئی پیر مشتبہ ہوگا تو میں اُسے بھی تھلانے میں بٹھالوں گا۔“ میں نے ذرا سوچ کر کہا۔ ”اگر آپ کو یہ شک ہے کہ میں آپ کے ساڈھو مہاراج کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آؤں گا تو کل صبح آجانا اور دیکھ لینا۔ اگر ساڈھو مہاراج کسی جرم میں ملوث ہوتے تو میں انہیں پورے احترام سے حوالات میں بند کر دوں گا۔“

اُن کے ساتھ دوستانہ انداز سے کچھ اور باتیں ہوئیں اور وہ چلے گئے۔ اُن کے چلے جانے سے میں خوش نہ ہوا۔ مجھے خطرہ نظر آ رہا تھا کہ قبضے کے ہندو شور شرابہ کریں گے۔

جب اُسے چرس ملی

میں نے رات دس بجے کے بعد ساڈھو کو اپنے دفتر میں بلایا اور دروازہ بند کر لیا۔

”میری بھیلی مجھے دے دے۔“ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”یہ دیکھ، ہاتھ جوڑ رہا ہوں۔“

میں چپ چاپ اُسے دیکھ رہا تھا۔ اگر میں تھانیدار نہ ہوتا اور یہ تھانہ نہ ہوتا تو نشے سے ٹوٹا ہوا ساڈھو مجھ پر حملہ کر دیتا۔ مجھے چپ دیکھ کر وہ میرے پاؤں پر گر پڑا۔۔۔ نشہ بڑی ہی بُری اور خطرناک عادت ہے۔

”اٹھو۔“ میں نے کہا۔ ”ہنچ پر بیٹھو۔“

وہ ہنچ پر بیٹھ گیا۔ اُس کا سر ڈول رہا تھا۔

”ہنچ بولو۔“ میں نے اُسے کہا۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ ایک لڑکی کو تم نے

کالے علم کے زور سے اپنے پاس بلایا اور وہ لڑکی واحدی کے حوالے کر دی

تھی؟۔۔۔ بتا دو۔ چرس دوں گا۔ شراب منگوادوں گا۔“

میں نے اُس کی گھنٹی دروازے تکال کر میز پر رکھ دی۔ وہ اٹھ کر اُس

کی طرف تیزی سے آیا میں نے گنتی اٹھا کر اپنے پیچھے کر لی۔

”پہلے میری بات کا جواب دو“ میں نے کہا۔

وہ پیچھے ہٹ کر دھک سے پنج پر بیٹھا۔ اب تو ایسے لگتا تھا جیسے بے ہوش ہو جاتے گا۔

”مان لیا میرے داروغے، مان لیا“ اُس نے بہکاتی ہوتی زبان میں کہا۔ ”لڑکی کو میں نے اُس کے گھر سے ایک عمل کے زور سے نکالا تھا“

”پچھنے کے لئے؟“

”نہیں میرے باپ! نہیں“ اُس نے جھنجھلا کر کہا۔ ”ایک شخص ہے علی رضا، اُس نے نکلواتی تھی۔ واحدی تو ویسے ہی آگیا تھا میں نے سوچا کہ اتنا قیمتی مال علی رضا کو کیوں دے دوں؟ میں نے واحدی سے کہا کہ مال موجود ہے۔ جیب خالی کرو اور مال لے جاؤ...“ وہ چپ ہو گیا اور کچھ دیر میرے منہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”ایک اور بات بتاؤں؟ مان لو گے؟“

”مان لوں گا“ میں نے کہا۔

”پہلے ایک کش لگوا دو“

”لگوا دیا“ میں نے کہا۔ ”لو۔ ذرا سا اشارہ دو تم کیا کہانی سنانا

چاہتے ہو؟“

”میں مسلمان ہوں“ اُس نے کہا۔ ”آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ

ہر دوار، بنارس اور دوسری جگہوں میں جہاں ہندوؤں کے سب سے بڑے مندر ہیں، وہاں کئی مسلمان سادھو اور جوگی بنے ہوتے ہیں“

مجھے ابھی معلوم نہیں تھا کہ اپنے مذہب کے متعلق وہ سچ کہہ رہا تھا

یا نہیں، البتہ اُس کا یہ کنا غلط نہیں تھا کہ بعض جرائم پیشہ مسلمان، سادھوؤں

کا بھیس بدل کر ہندوؤں کے مقدس مقامات مثلاً ہر دوار، بنارس، کنبھ

وغیرہ پر چلے جاتے اور عیش ووج کرتے تھے۔ اس بہروپ میں سب سے زیادہ مشکل کام یہ تھا کہ سادھوؤں کی زبان بولنی پڑتی اور اُن جیسی اداکاری

کرتی ہوتی اور ہندوؤں کے مذہب سے واقفیت لازمی تھی۔ بعض مسلمان

اس نقالی میں کمال حاصل کر لیتے تھے۔ یہ تھا تو جرم لیکن وہ ہندوؤں کے

لئے مقدس بن جاتے تھے۔ ہر دوار اور بنارس میں تو سارے ہندوستان

کے ہندو جایا کرتے تھے۔ وہ وہاں کے سادھوؤں کو زیادہ مقدس سمجھتے

تھے۔ ایک سے ایک خوبصورت ہندو عورت ان کی خدمت بڑے فخر سے

کرتی اور پیسے الگ دیتی تھی۔ بے اولاد عورتیں تو ان کی ماندیاں ہوتی تھیں۔

وہ ان سے اولاد کے لئے تعویذ نہیں لیتی تھیں نہ جنتر منتر کراتی تھیں۔

اپنا آپ ان کے حوالے کر کے انہیں صاف کہتی تھیں کہ بچو چاہیے۔ ان کے

خانہ بڑی خوشی سے ان بچوں کو قبول کرتے تھے۔

یہ سادھو جسے میں نے پکڑا تھا، بڑا کامیاب بہروپ بنا ہوا تھا اُس

نے مجھے اپنا اصل نام شفاعت علی بتایا تھا۔

”آپ میرے مسلمان بھائی ہیں“ اُس نے کہا۔ ”مجھے عیش کرنے

دیں۔ آپ کا اس میں کیا نقصان ہے؟“

”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم ہندو ہو یا مسلمان!“ میں نے

کہا۔ ”مجھے اُس لڑکی کے متعلق کچھ بتاؤ۔“

”آپ کو بتا دیا ہے کہ اُسے میں نے گھر سے نکالا تھا“ اُس نے

کہا۔ ”اب ایک کش لگوا دیں اور مجھ سے کہانی سنیں۔“

اُس نے جس طرح ہنڈر ہو کر بات کی، اس سے میں نے اندازہ لگایا

کہ پکا جرم ہے۔ میں نے اُس کی گنتی اُس کے حوالے کر دی۔ وہ گنتی پر لپوں

جھٹا جیسے بلی جھپچھڑے پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ اُس نے بڑی تیزی سے گنتی

سے تبا کو نکالا، ہتھیلی پر رکھ کر اس میں چرس ملائی اور ٹوپی بھر کر جلتی ہوئی

دیا سلائی تبا کو پر رکھ کر اتنا لمبا کش لیا کہ پورے کا پورے تبا کو راگہ کر ڈالا۔

وہ اتنا بڑی طرح چرس کا عادی تھا کہ اُس نے سارا دھواں نگل لیا اور

آنکھیں بند کر لیں۔ دس پندرہ سیکنڈ بعد اُس نے دھواں چھوڑنا شروع کیا تو

کتنی ہی دیر اُس کے منہ اور ناک سے دھواں نکلتا ہی رہا۔

پھر اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ اُس نے چھوٹے چھوٹے تین چار مزید کش لئے تو میں نے دیکھا کہ اُس کا چہرہ چمک اٹھا تھا جیسے کسی مریض کو تازہ خون دے دیا گیا ہو مجھے معلوم تھا کہ اُس نے شام کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ میں نے اُس کے لئے کھانا منگوایا۔

ایک راز، بڑا ہی پُر اسرار

وہ نارمل حالت میں آگیا کہنے لگا کہ پہلا بڑا امتحانیدار (سب انسپٹر بمل داس) بڑا اچھا آدمی تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اُس سے زیادہ اچھا آدمی ہوں لیکن صرف اُس کے ساتھ اچھا کرتا ہوں جو مجھے دل کا راز دے دیتا ہے۔

اُس نے مجھے دل کا راز دے دیا۔

اپنے متعلق اُس نے اتنا ہی بتایا کہ دس سال کی عمر میں وہ جرأت کی دنیا میں داخل ہوا تھا۔ اُس نے دو استادوں کی بہت خدمت کی۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں وہ لپکا نو سرباز بن گیا۔ اُس نے زبان کی ہیرا پھیری میں کمال حاصل کیا۔ جرائم کی دنیا میں اُس نے جس کام میں ہاتھ ڈالا اُس میں کامیابی حاصل کی۔ اس پیشے میں اُس کی ملاقات ایک ایسے آدمی سے ہوئی جو کالاً علم جانتا تھا اور یہی اُس کا پیشہ تھا لیکن وہ فراڈ زیادہ چلاتا تھا۔ شفاعت علی نے جو اُس وقت ششکا کہلاتا تھا، اس آدمی کی بہت خدمت کی۔ اُس کی کرامات کی تشہیر بھی خوب کی اور اُس کے لئے سائل پچانس پچانس کر لاتا رہا۔ حامل نے بھی کمایا اور شفاعت نے بھی خوب کمائی۔

شفاعت کالے علم کے دو چار گھر کیٹھنا چاہتا تھا لیکن عامل اُسے یہ راز نہیں دیتا تھا۔ شفاعت سے وہ عجیب عجیب کام لیتا تھا، مثلاً قبرستان سے مُردے کی کوئی خاص ہڈی لانا، کوڑے کے گھونسلے میں سے چھوٹی سی ایک دو کڑیاں نکال لانا، کسی خاص عمر کی عورت کے سر کے تین چار بال اور

ایسی اور اشیاء تھیں جو وہ استاد کے حکم سے کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ لاتا تھا۔

وہ نشے میں تھا اس لئے اُس کی زبان بے قابو ہو گئی تھی۔ اُس کی یہ حالت میرے لئے فائدہ مند ہو سکتی تھی۔ نشے میں انسان بڑے خطرناک راز اُگل دیتا ہے میں نے اُس کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ بولتا رہے۔

”تک صاحب!“ اُس نے کہا۔ ”ہم لوگ اتنے استاد نہیں ہوتے، دراصل لوگ ہیوقوف ہیں۔ لوگ حاجت مند بھی ہوتے ہیں۔ اُن کے مسئلے حل نہیں ہوتے تو ہم جیسے سادھوؤں اور عالموں کے پاس چلے جاتے ہیں۔ پیروں کو مانتے ہیں۔ کسی پیر کو میرے سامنے بٹھا دو۔ میں اُس کے مُنہ پر اُس کی اصلیت ننگی کر دوں گا۔ اُن سے تو وہ اچھے ہیں جو کالاً علم جانتے ہیں اور لوگوں کے کام کر دیتے ہیں....“

”لوگوں کو دیکھو وہ کس حد تک پہنچتے ہیں۔ میری عمر سولہ سترہ سال تھی۔ استاد نے مجھے ایک ویران بیابان سے ایک چیز لانے کو کہا تھا۔ دوڑا تھا میل دوڑ جاتا تھا۔ راستے میں ایک برساتی نالہ پڑتا تھا جو بہت چوڑا تھا۔ اس کے کنارے ٹیلوں جیسے اوپنچے تھے۔ اُن دونوں اس نالے میں بہت مٹھوڑا پانی تھا....“

”میں نالے کے کنارے پر جا رہا تھا۔ چاندنی رات تھی۔ مجھے نالے میں ایک عورت کھڑی نظر آئی۔ وہاں پاٹ خشک تھا۔ دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ پانی بہہ رہا تھا۔ درمیان میں خشکی تھی۔ آگے جا کر دونوں کناروں کا پانی درمیان کی طرف جاتے جاتے آپس میں مل گیا تھا۔ جہاں دونوں دھار سے ملتے تھے وہاں وہ عورت کھڑی تھی اور اُس کے جسم پر ایک بھی کپڑا نہیں تھا۔ میں کنارے سے اُتر کر اُس کی طرف گیا تو اُس نے چیخیں مارتی شروع کر دیں۔ میں رُک گیا۔ وہ انسان نہیں ہو سکتی تھی۔ رات کو اس دیرانے میں جالے کی جراثیم کوئی عورت نہیں کر سکتی تھی۔ یہ چوڑیل تھی لیکن میں بھاگا نہیں۔ استاد نے ایک لغویہ میرے گلے میں ڈال رکھا

تھا اور چھوٹی سی ایک چھڑی مجھے دی ہوئی تھی جو رات کو جنگل میں سے گزرتے ہاتھ میں رکھی ہوئی تھی۔ اُستاد کہتا تھا کہ اس ٹھونڈ اور چھڑی کی موجودگی میں جن چڑیل اور بھوت پریت قریب نہیں آتے....

”اُس وقت یہ دونوں چیزیں میرے پاس تھیں۔ میں اُس عورت تک چلا گیا۔ اُس کے ہاتھ اور پاؤں دیکھے۔ یہ سیدھے تھے۔ سُنا تھا چڑیلوں کے ہاتھ پاؤں اُلٹے ہوتے ہیں۔ وہ آخر عورت ہی نکلی۔ وہ جوان تھی۔ میں نے اُسے ڈرایا تو وہ میرے پاؤں میں بیٹھ گئی۔ وہ بالکل ننگی تھی کسی سادھونے اُسے ایک ٹوٹا بتایا تھا جو کسی دریا، ندی یا نالے میں اُس جگہ کرنا تھا جہاں پانی کے دودھارے ملتے ہیں۔ وہ اولاد چاہتی تھی....

”میں نے اُسے کہا کہ وہ یہ ٹوٹا چھوڑ دے ورنہ کوئی اُسے زبردستی اپنے ساتھ لے جاتے گا پھر وہ باقی عمر روتے گزار دے گی۔ ان طریقوں سے کبھی کسی کو اولاد نہیں ملی.... وہ ہندو تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ کپڑے پہن لے۔ وہ ڈر سے ہنکلا رہی تھی اور میری منتیں کرتی تھی کہ میں اُسے کچھ نہ کہوں اور کسی کے ساتھ ذکر بھی نہ کروں۔ میں اُسے کنارے کے اوپر ایک جگہ لے گیا۔ اُس کا ڈر دور کیا۔ اُس نے میری بات سمجھ لی اور میری بات پر آگئی۔ تب اُس نے کہا کہ اُس کا خاوند اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ فلاں جگہ آجایا کرے۔ وہ آتی رہی اور اُس کے پھلے پچے کا باپ میں تھا“

اُس نے دو تین اور واقعات سُنا ڈالے۔

عالم اُستاد نے شفاعت پر یہ کہہ کر اُسے ایک عمل سکھا دیا۔ یہ بڑا ہی مشکل عمل تھا چاند کی خاص تاریخوں کی پوری پوری راہیں جگانا پڑتا تھا۔ ہندسوں کا حساب جوڑنا ہوتا تھا اور نہ جانے کیا کیا پاڑ بیٹنے پڑتے اور کیسے کیسے پرہیز کرنے ہوتے تھے۔

مجھے اس عمل کے طریقوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لئے میں نے اُس سے طریقے معلوم نہ کئے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کے اُستاد

نے اُسے ایک بار یہ عمل کر کے دکھایا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا تھا کہ ایک عورت اُس کے پاس پہنچ گئی تھی لیکن اس عمل کی کچھ اور ضروریات بھی تھیں ورنہ عمل کرنے والے کو نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا۔

کالے بکرے کی سری اور دل

شفاعت نے مجھے بتایا کہ ایک بار اُس نے یہ عمل کیا اور ناکام رہا تھا۔ دوسری بار اُس نے شکوری پر عمل کیا اور کامیاب رہا۔ اُس سے یہ عمل علی رضائے کر آیا تھا۔ شفاعت نے انکار کر دیا تھا لیکن علی رضائے اُسے بے شمار رقم پیش کی تھی۔ اُس نے شفاعت سے کہا تھا کہ وہ چند بیگھ زمین بھی اُس کے نام کرادے گا۔

”علی رضا کو میں بہت اچھی طرح جانتا تھا“۔ شفاعت نے مجھے سنایا۔ ”بلکہ آپ اُسے میرا دوست کہہ سکتے ہیں.... وہ تھانے کا منجبر ہے۔ وہ میرے جہانم سے اچھی طرح واقف ہے۔ ایک روز اُس نے مجھے کہا کہ ایک لڑکی نے اُس کی نیند حرام کر دی ہے۔ پھر وہ مجھے بتاتا رہا کہ اُس نے لڑکی کو پیغام بھیجے ہیں لیکن وہ ہاتھ نہیں آتی۔ ایک روز وہ غصے میں میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ لڑکی (شکوری) نے اُس کی بے عزتی کر دی ہے۔ اب وہ اُسے خراب کر کے ہی دم لے گا۔ علی رضا کے پاس زمین بہت ہے اور یہ بھی ہے۔ وہ پولیس کا منجبر اس لئے بنا ہوا ہے کہ اُس کی اپنی کثرت پر پردہ پڑا ہے....

”اُس نے مجھے کہا کہ سُنا ہے کالے علم سے کسی بھی انسان کو اپنے زیرِ کیا جاسکتا ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ لڑکی کو دھوکے سے باہر بلاؤ اور پکڑ لو۔ اُس نے کہا کہ گاؤں میں میری حیثیت اچھی اور عزت ہے، دوسری وجہ یہ کہ لڑکی باہر نہیں آتی۔ مجھے کوئی عامل یا جوگی بتاؤ جو مجھے کوئی ٹوٹا یا ٹھونڈ بتائے۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ میں ایک عمل کر سکتا ہوں لیکن

وہ بہت مشکل ہے اور میرے لئے خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔۔۔
 ”علی رضا میرے پیچھے پڑ گیا۔ یقین کرنا کہ اُس نے پانچ سو روپیہ میرے
 آگے رکھ دیا اور کہنے لگا کہ اور مانگو کیا مانگتے ہو، زمین مانگو، نقد مانگو۔
 میں لڑکی کو خراب کر کے چھوڑ دوں گا۔ میں نے اُسے کہا کہ کالے بکرے
 کی ہسری لے آؤ اور اسی بکرے کا دل بھی ساتھ ہو۔“

اس بہروپے سا دھونے مجھے کچھ اور چیزیں بھی بتاتی تھیں جو
 اُس نے علی رضا کو لانے کے لئے کہا تھا۔ مجھے بکرے کی ہسری اور دل
 یاد رہ گیا ہے۔ اُس نے کسی پھول کا بھی نام لیا تھا جو عام نہیں ہوتا۔
 جنگلوں میں کہیں کہیں ہوتا ہے۔

علی رضا کالے بکرے کی ہسری اور دل لے آیا۔ شفاعت نے اُسے
 کہا کہ یہ ہسری لڑکی کے گھر کے دروازے کے سامنے بلکہ دہلیز کے ساتھ
 زمین میں دبائی ہے تاکہ لڑکی اس کے اوپر سے گزرے اور دل کسی
 ویران جگہ زمین میں دبانا ہے۔ شفاعت نے تعویذ یا نقش لکھ کر ایک بکرے کی
 ہسری کے منہ میں ڈالا اور ایک دل کے اندر داخل کر دیا۔

علی رضا نے دو روز بعد شفاعت کو بتایا کہ وہ دونوں چیزیں اُس
 کی بتائی ہوئی جگہوں میں دفن کر آیا ہے۔

شفاعت نے اُسے کچھ اور کرنے کو بھی کہا تھا جو اُس نے کر دیا۔
 شفاعت نے تیرہ راتیں جاگ کر اپنا کوئی عمل کیا۔ وہ کہتا تھا کہ عمل بڑا ہی
 سخت تھا جو اُس نے کر لیا اور ایک رات لڑکی اپنے آپ اُس کی گت
 میں آگئی۔

شفاعت کا علم یہاں پر ختم ہو گیا۔ اُسے یہ خطرہ نظر آنے لگا کہ لڑکی
 سے یہ اثر صاف ہو گیا تو یہ مصیبت کھڑی کر دے گی۔ اُسے معلوم نہیں تھا
 کہ لڑکی کو زیادہ دیر تک اس اثر میں کس طرح رکھنا ہے۔ اُس نے سوچا کہ
 وہ علی رضا کے گھر جا کر اُسے ساتھ لے آتے اور لڑکی اُس کے حوالے
 کر دے۔

”خدا کی قسم سرکار!“ شفاعت نے کہا۔ ”میرے آگے کوئی
 ساری دُنیا کی دولت رکھ دے، میں یہ کام پھر کبھی نہیں کروں گا۔ لڑکی
 میرے سامنے بیٹھی تھی اور مجھے اس طرح پتہ چل رہا تھا کہ گت کے باہر
 جن بھوت ناچ رہے ہیں۔ میں جان گیا کہ عمل اُلٹ ہو رہا ہے اور اب
 میری خیر نہیں۔ اتنے میں واحدی آنکلا۔ میں واحدی کو جانتا ہوں۔ میں
 نے اُسے کہا کہ لڑکی کو لے جاؤ لیکن تمہیں گھنٹوں کے اندر اندر ٹھکانے پر
 پہنچا دینا۔ میں نے دو ہزار قیمت بتائی۔ اُس نے دو سو روپیہ دے کر کہا
 کہ باقی پھر دوں گا۔ میں نے اُسے کہا کہ رقم آجائے گی، تم لڑکی کو لے جاؤ۔“
 ”تم نے یہ نہیں کہا تھا کہ اتنا قیمتی مال علی رضا کیوں لے جاتے؟“
 ”میں نے کہا تھا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”لیکن اصل وجہ خوف
 تھی۔۔۔ میں نے لڑکی سے جان چھڑائی اُسے واحدی لے گیا۔ علی رضا کو
 میں نے کہہ رکھا تھا کہ عمل پورا ہو گیا تو میں اُسے اطلاع دوں گا اس لئے
 وہ میرے پاس نہ آیا۔۔۔“

وہ بولتے بولتے چُپ ہو گیا، اور کچھ سوچنے لگا۔
 ”جناب!“ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں نشے سے ٹوٹا
 ہوا نہ ہونا تو آپ میرے سینے سے یہ راز کبھی نہ نکال سکتے۔ اب مجھے ایک
 سوچ آتی ہے۔ میں آپ کو یہ راز کس قیمت پر دے رہا ہوں؟ کیا آپ
 مجھے وعدہ معاف گواہ بنائیں گے؟ مجھے کیا رعایت دیں گے؟“
 میں اُس کے سامنے کرسی پر اور وہ بیچ پر بیٹھا تھا۔ میں نے
 اُسے کہا کہ میں اُسے کوئی بھی رعایت نہ دوں تو وہ کیا کرے گا؟
 اُس نے بے تکلف دوستوں کی طرح میری ران پر ہاتھ مارا اور
 کہا۔ ”یہ کر کے دیکھ لو۔ میں زبان بند کر لیتا ہوں۔ میری ہڈیاں توڑ دو،
 میری زبان نہیں کھلے گی۔۔۔ آپ میری زبان کو چلتا رکھیں سرکار! میں
 بڑے کام کا آدمی ہوں۔“

ہندو اپنے سادھو مہاراج کو ٹھہرانے کے لئے بڑا قابل وکیل کورٹ میں بھیجیں گے۔ میں نے ان حالات میں سوچا کہ اسے بری ہی ہونا ہے تو کیوں نہ میں اس کے سر پر اپنا احسان رکھوں۔ اگر آگے چل کر مقدمے کی صورت کچھ اور ہو گئی تو اسے وعدہ معاف گواہ بنالوں گا۔ میں وعدہ معاف گواہ کا قائل نہیں تھا لیکن کیس کی صورت کچھ اور بنتی جا رہی تھی۔

”دیکھ شفتے!“ میں نے اُسے کہا۔ ”تم نے مجھے مسلمان بھائی کہا ہے اور مجھے دل کا راز دے دیا ہے۔ دل میں جو کچھ ہے میرے آگے رکھ دو اور اپنے آپ کو وعدہ معاف گواہ سمجھو۔۔۔ میں یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ مجھے ذرا سی بھی گنجائش مل گئی تو تمہیں گرفتاری نہیں کروں گا۔ کہو گے تو گواہ بھی نہیں بناؤں گا۔“

اُس نے میری ران پر ایک اور تھپڑ مار کر اور ہاتھ میرے آگے کر کے کہا۔ ”ہاتھ آئے۔“ میں نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا تو اُس نے کہا۔ ”تمہاری قسم وہ عیش کراؤں گا، آپ کہیں گے جنت اور کیا ہوگی۔ شہر کی کسی ہندو لڑکی کی طرف اشارہ کر دینا اور ہماری گف میں آجانا۔ کہو گے تو یہاں آپ کے گھر میں اتار دوں گا۔ یہاں کے بہن بھی مجھے بھگت کہتے ہیں، پرہوں میں بگلا بھگت۔ یاد رکھنا، یہ تیرا میرا راز ہے۔ پلیسوں والا ہاتھ نہ کر جانا۔“

وہ چرس کے کش لگاتے چلا جا رہا تھا۔ کمرہ دھو تیس سے بھر گیا اور مجھے چکر آنے لگے۔ میں نے کھڑکیاں اور پچھلا دروازہ کھول دیا۔ اتنی چرس پی کر بھی ذہن مارل بائیں کر رہا تھا۔ اُس پر لٹنے کا اثر خاصا تھا۔ ہم دونوں کا مسئلہ یہ تھا کہ اُسے میری ضرورت تھی اور مجھے اُس کی اصلیت چھپا کر رکھنی تھی اور اُسے میرا خفیہ مخبر بننا تھا۔ یہ پولیس کی چکرت بازیاں ہوتی ہیں۔ ہر تھانیدار کو یہ چکرت چلانے پڑتے ہیں۔ میں نے بھی معاہدہ کر لیا لیکن ابھی یہ دیکھنا تھا کہ وہ آگے کیا کچھ بتاتا ہے۔

اُس نے آگے جو کہانی سنائی وہ پورے تھی کہ واحدی دوسور و سپر دے

اور وہ رونے لگی

وہ مجھے ملزموں کی طرح بیان نہیں دے رہا تھا۔ میں نے بھی تھوڑا لارویہ نہیں رکھا تھا۔ اُس نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ بڑے کام کا آدمی۔ ایسے آدمی پولیس کے لئے آنکھیں اور کان ہوتے ہیں۔ تھانیدار کو جو چیز نہیں آتی، وہ یہ لوگ دکھا دیتے ہیں۔ اُس نے وعدہ معاف گواہ بننے کا کی اور رعایت کی بات کی تو کچھ دیر تک ہماری باتیں اسی پر ہوتی رہیں نہیں کہ میں آپ کو وہ سارے مکالمے سناؤں۔ ایک خاص بات۔ ابھی سنا دیتا ہوں۔

میں سمجھ گیا تھا کہ لڑکی کس طرح گھر سے نکالی گئی ہے اور لڑکی کرنے میں سادھو کا کتنا کچھ عمل دخل ہے۔ لڑکی واحدی لے گیا تھا۔ یہ یعنی شفاعت عرف شفق کو سزا دلانا تو درکنار میں اُسے گرفتار بھی نہ کر سکتا تھا۔ ایک وجہ یہی کہ کالے علم کے متعلق قانون بہت ہی ڈھیلا ہے نہ ہونے کے برابر تھا۔ میں نے ایسے دو کیسوں میں ملزموں کو سزا دلانا تو اُن کیسوں میں مجھے کچھ گنجائش نظر آگئی تھی اور میں نے جھوٹے سچے گواہ سے بیڈنگ کر لی تھی۔ دونوں کیسوں میں پی پی (سرکاری وکیل) بڑے بل گئے تھے۔ شفاعت کے حق میں یہ بات بھی جاتی تھی کہ لڑکی اُس کے سے براہ نہیں ہوتی تھی۔ اُس کے خلاف ذرا سی بھی شہادت نہیں تھ

کے اپنے بیان پر اُسے سزا نہیں دلائی جاسکتی تھی۔ وہ کورٹ میں مخرف بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے اپنے تجربے کی روشنی میں دیکھ لیا تھا کہ شفاعت کو بڑے میں لے جاؤں تو بھی اسے سزا نہیں ملے گی۔ مجھے یہ بھی احساس

اُسے کچھ سونگھایا ہے یا کچھ پلا رکھا ہے؟“
 ”ایک سادھو سے اسی حالت میں خریدی ہے۔“ واحدی نے
 جواب دیا۔ ”وہ کہتا تھا کہ کالے جادو کے زور سے وہ لڑکی کو گف میں
 لایا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ تین گھنٹوں کے اندر لڑکی کو ٹھکانے پر لے
 جانا پھر اس سے اثر اُتر جائے گا.... یہ سادھو شق تھا ہے۔“
 ”اثر اُتر جائے گا تو تم کیا کرو گے؟“ رُحسے نے پوچھا۔
 ”تم جانتے ہو استاد! یہ میرا پیشہ ہے۔“ واحدی نے کہا۔ ”کچھ کر
 لوں گا۔“ اُس نے منٹ سماجت کے لہجے میں کہا۔ ”میرے کاروبار
 میں لات نہ مارو استاد! تمہیں کیا کمی ہے۔ اگر لڑکی کو رکھنا ہے تو سودا
 کر لو۔“

”نہ واحدی!“ رُحسے نے کہا۔ ”میں نے کبھی کوئی عورت خریدی
 نہیں اور کسی سے کبھی عورت چھینی بھی نہیں۔ میرے آدمی مجھے خوش کرنے
 کے لئے لڑکی کو اور تمہیں کچھ کر لے آتے ہیں۔ کچھ دیر بیٹھو۔ گپ شپ
 لگاؤ اور اپنا مال لے جاؤ۔“

واحدی بھی جراتم کی دنیا کا آدمی تھا۔ رُحما اُسے ناراض نہیں کرنا چاہتا
 تھا۔ اُس کے یہ چار آدمی جو واحدی اور شکوری کو رُحسے کے پاس لے گئے
 تھے، واحدی کو شاید جانتے تھے۔ رُحسے نے واحدی کو خاطر تو اضع کے لئے
 روک لیا اور کہا کہ وہ رات وہاں گزارنا چاہے تو ٹرک جلتے لیکن واحدی
 جلدی میں تھا۔

شکوری کو وہیں چار باقی پر بٹھا دیا گیا تھا۔ اچانک شکوری بیدار
 ہو گئی۔ اُس نے ادھر ادھر دیکھا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”میں کہاں ہوں؟“ اُس نے پوچھا۔ ”تم سب کون ہو؟“
 اور وہ رونے لگی۔

کر لڑکی کر لے گیا۔ شفاء بہت خوش تھا کہ واحدی سے اُسے اگر زیادہ نہیں تو
 ڈیڑھ ہزار روپیہ مزید ضرور مل جائے گا۔ واحدی تین روز بعد شفاعت کے
 پاس آیا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ اُس نے شفاعت کو بتایا کہ وہ لڑکی کو لے جا
 رہا تھا تو راستے میں اُسے چار آدمی مل گئے۔ انہوں نے لڑکی کو کھڑا لیا۔ واحدی
 نے اُن سے لڑکی جھگڑا لیا۔ وہ واحدی کو بھی رسیوں میں باندھ کر اپنے ساتھ
 لے گئے۔ وہ اکیلا چار آدمیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

لڑکی ابھی تک پُراسرار اثر میں تھی۔ اُسے جیسے پتہ ہی نہ ہو کر کیا ہو
 رہا ہے۔ واحدی نے شفاعت کو بتایا کہ وہ ان دونوں کو جہاں لے گئے، وہ
 رُحسے رہزن کا ٹھکانہ تھا۔ یہ چاروں رُحسے کے آدمی تھے جو کہیں سے آ رہے
 تھے کر راستے میں انہیں واحدی اور شکوری نظر آ گئے۔ شکوری ان کے
 استاد کے لئے بڑا خوبصورت تحفہ تھی۔

واحدی رُحسے کو خائشا تھا۔ رُحما اُس علاقے کا مشہور دُکیت اور رہزن
 تھا۔ اُس کا ٹھکانہ دوسرے تھالے کے علاقے میں تھا۔ میں آپ کو اُس
 زمانے کے ڈاکوؤں اور رہزنوں کے متعلق پہلے کبھی بہت کچھ بتا چکا ہوں
 وہ آج کل کے شہروں کے جرائم پیشہ لوگوں سے بہت مختلف ہوتے تھے۔
 انہیں پولیس کی یا پولیس کے کسی اعلیٰ افسر کی حمایت حاصل نہیں ہوتی تھی
 بلکہ پولیس کے ساتھ اُن کی مسلسل جنگ رہتی تھی۔ انہیں دیہات کے لوگوں
 کی حمایت حاصل ہوتی تھی۔ وہ ڈاکو بہت بڑی اسامیوں پر ماتہ ڈالتے
 تھے۔ رُحما اتنا زیادہ طاقتور تو نہیں تھا لیکن اس میدان میں اُس کی دھاک
 بیٹھی ہوتی تھی۔

رُحما اپنے ٹھکانے پر ہی تھا۔ لڑکی اور واحدی کو رُحسے کے سامنے
 لے گئے۔ رُحما لڑکی کو دیکھ کر ایک تو اُس وجہ سے حیران ہوا کہ لڑکی بہت
 ہی خوبصورت تھی اور حیرت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ لڑکی اپنے آپ میں
 نہیں تھی۔ اُسے کہا بیٹھ جا تو وہ بیٹھ گئی۔ اُسے کہا اٹھ تو وہ اُٹھ کھڑی ہوئی
 ”کیوں واحدی؟“ رُحسے نے اُس سے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟ تم نے“

منہیں سکتا۔

سوال جواب ہوتے تو شکوری نے بتایا کہ اُس کے گاؤں میں علی رضا نام کا ایک آدمی ہے جو اُس کے پیچھے بڑا گیا تھا لیکن شکوری نے اُس کی بے عزتی کر دی۔ علی رضا نے اسے دھمکی دی تھی کہ وہ اُسے خراب کر کے دم لے گا۔

”میرے ابا جان بہت شریف آدمی ہیں“ شکوری نے کہا۔
”میں نے انہیں نہیں بتایا تھا کہ علی رضا مجھے تنگ کرتا ہے اور اُس نے مجھے یہ دھمکی دی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ علی رضا بد معاش آدمی ہے، میرے ابا جان کی بے عزتی کر دے گا۔۔۔ کیا تم ایک شریف اور کنواری لڑکی کی عزت کی حفاظت نہیں کر سکتے؟“

”کیوں نہیں کر سکتا؟“ رُحمے نے کہا۔ ”میں نے تمہیں گھر سے منہیں نکلوایا۔ تم عرشِ قہمت ہو کہ میرے پاس پہنچ گئی ہو۔ میں تمہیں اس آدمی کے ساتھ نہیں جانے دوں گا۔ میں تمہیں تمہارے گھر تک پہنچا دوں گا اور تم کنواری رہو گی۔“

”میرا کاروبار خراب نہ کر دے“ واحدی بول پڑا۔ ”یہ بکواس کرتی ہے۔ شفتے کے پاس خود آتی ہو گی۔ میں نے تو تمہیں وہ بات بتائی ہے جو مجھے شفتے نے بتائی تھی۔ میری رقم کا کیا بنے گا؟“

”واحدی بھاتی؟“ رُحمے نے اُسے کہا۔ ”میرا یہ پیشہ (دکنیتی) آہل ہے۔ باپ دادا ایسی کام کرتے چلے آتے ہیں۔ باپ نے وصیت کی تھی کہ مجبور عورت پر، بچے پر اور بوڑھے پر ہاتھ نہ اٹھانا۔ صرف اُس عورت کو اپنے پاس رکھنا جو اپنی خوشی سے کہے کہ وہ تمہارے پاس رہنا چاہتی ہے۔۔۔ میں تم پر یہ کرم کرتا ہوں کہ لڑکی نہ تمہیں دیتا ہوں نہ اسے اس کے گھر بھجوتا ہوں، پہلے میں شفتا سے بات کر لوں۔۔۔ میں علی رضا کو جانتا ہوں۔ اُس نے ایک بار میری نجری کی تھی۔۔۔ لیکن واحدی، جب تک مجھے اس لڑکی کے متعلق پورا علم نہ ہو جائے، تم یہیں رہو گے۔ واپس آکر بتاؤں گا کہ میں کیا کر لوں گا۔“

وہ تمہیں لڑکی دے دے گا

شکوری دروازے کی طرف دوڑی۔ اُسے پکڑ لیا گیا۔ وہ چیختی چلائی اور کسی کے ہاتھ نہیں آتی تھی۔ شفاعت کے عمل کا اثر ختم ہو گیا تھا۔ بڑی مشکل سے اُس پر قابو پایا گیا۔

رُحمے نے اُس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور گھر سے کس طرح بھلی ہے۔ اُس نے بتایا کہ میں اپنے گھر میں اپنی چار پاتی پر سوتی تھی، اب یہاں ہوں۔ اُس نے اپنے باپ اور اپنے خاندان کے متعلق بتایا اور رُحمے کو یقین دلانے کے لئے کہا کہ وہ شریف اور باعزت گھر کی شریف لڑکی ہے اور اُس کی منگنی ہو چکی ہے۔

مختصر یہ کہ شکوری نے رورو کر اپنے متعلق اور اپنے گھر کے متعلق سب کچھ بتایا۔

”کیا تم کبھی کسی سادھو، سنیاسی یا جوگی کے پاس گئی ہو؟“ رُحمے نے اُس سے پوچھا۔

”میں مسلمان ہوں“ شکوری نے کہا۔ ”مجھے سادھوؤں سنیاسیوں کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے؟ میں پانچ وقت نماز پڑھتی ہوں۔ میں تو کبھی کسی پیر کے پاس بھی نہیں گئی۔ میں صرف خدا، رسول اور قرآن مجید کو مانتی ہوں۔“ اُس نے ڈر سے ہوتے لہجے میں پوچھا۔ ”کیا میں خواب دیکھ رہی ہوں؟ خدا کے لئے مجھ کو بتاؤ۔“

رُحمے نے اُسے بتایا کہ اُسے گھر سے کس طرح نکالا گیا ہے۔ وہ بہت گھبراتی اور پھر رو لگی۔ رُحمے نے اُس سے پوچھا کہ اُن کا کوئی دشمن ہے؟ شکوری نے جواب دیا کہ اُس کا خاندان ایسا ہے کہ ان کا کوئی دشمن ہو ہی

لڑکی کو رُحسے نے اپنی بیوی کے حوالے کر دیا۔ لڑکی کو اُس نے تسلی دی کہ یہاں اُس کی عزت بالکل محفوظ رہے گی۔ لڑکی روتی تھی۔ رُحسے نے اُسے سمجھایا کہ وہ بہت بڑے خطرے میں ہے، خاموشی سے یہیں رہے اور اُسے گھر پہنچا دیا جائے گا۔

رحما کسی وجہ سے شفاعت کے پاس نہ جاسکا۔ اگلا دن اور اگلی رات بھی گزرتی۔ واحدی تنگ آگیا۔ اُس نے رُحسے سے کہا کہ وہ لڑکی سے دستبردار ہو جائے اور شفاعت سے جا کر اپنی رقم مانگے گا۔

”جاؤ واحدی!“ رُحسے نے اُسے کہا۔ ”لیکن کان کھول کر سن لو۔ اگر تم لڑکی کی نشاندہی کر دی اور پولیس کو میرا ٹھکانہ بتا دیا تو تم مجھے جانتے ہو تمہارے پورے خاندان کو تباہ کر دوں گا۔“

واحدی ایسی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ وہ وہاں سے شفاعت کے پاس واپس آیا اور یہ ساری کہانی اُسے سنائی۔ شفاعت اتنا بچا نہیں سمجھا اُسے دوسروں پر واپس کر دیتا۔ اُس نے واحدی سے کہا کہ وہ پوری رقم ادا کرے، ورنہ اُسے بہت خراب کیا جائے گا۔

”مجھے ایک بات بتاؤ شفعے!“ میں نے اُس سے پوچھا۔ ”کیا تم لڑکی کو ایک بار پھر اپنے اثر سے واپس نہیں لاسکتے تھے؟“

”نہیں جی!“ اُس نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”یہ بڑا اٹنا ہے۔ میں تو ایک بار کر کے بچھڑا رہا تھا۔ اگر یہ کام اتنا آسان ہوتا تو لوگ ایک دوسرے کی بیٹیوں کو خراب کرتے پھرتے۔“

شفاعت علی نے مجھے سنایا کہ رُحسے کے ساتھ اُس کا دوستانہ تھا اُکا کار و بار رُحسے کے ساتھ بھی چلتا تھا۔ رُحسے سے پہلے واحدی اُس کے پاس آگیا۔ شفاعت نے اُسے ڈرا دھمکا کر بھگا دیا۔ اُس رات رحما اُس کے پاس آیا اور شکوری کے متعلق پوچھا۔ شفاعت نے اُسے پوری تفصیل سے سنایا کہ لڑکی اُس کے پاس کس طرح آتی تھی۔ اُس نے علی رضا کے متعلق بھی بتایا۔

”کیا میں یقین کر لوں کہ لڑکی عزت دار اور شریف گھرانے کی ہے؟“

”اگر شریف نہ ہوتی تو علی رضا نے جو جو لالچ دیتے تھے، وہ قبول کر لیتی۔“ شفاعت نے کہا۔ ”علی رضا کہتا تھا کہ یہ لڑکی جادو کے زور سے ہی آسکتی ہے۔“

”میں لڑکی کو اُس کے ماں باپ کے حوالے کروں گا۔“ رُحسے نے کہا۔ ”میرے باپ دادا نے کسی مجبور عورت پر کبھی ظلم نہیں کیا تھا میرا باپ کہا کرتا تھا کہ اس طرح کاروبار سے برکت اُٹھ جاتی ہے۔“

عزیز کریں کہ وہ لوگ ڈکیتی اور رہزنی کو جائز اور بابرکت پیشہ سمجھا کرتے تھے۔ رُحسے نے یہ بھی کہا کہ علی رضا اُس کے ہاتھ چٹھ گیا تو اُسے وہ قتل نہیں کرے گا لیکن جینے کے قابل بھی نہیں چھوڑے گا۔ رُحسے نے کہا کہ وہ پولیس کا مخبر ہے اس لئے ہمدعاں بنا چھڑا ہے اور شریف لوگوں کی عزت سے کھیلتا ہے۔

شفاعت نے رُحسے سے کہا کہ ایسی بات ہے تو وہ علی رضا کو اُس تک پہنچا دے گا۔

”کسی طرح اُسے مجھ تک پہنچا دو۔“ رُحسے نے کہا۔

”پہنچا سمجھو۔“ شفاعت نے کہا۔

”اور میری ایک بات کان کھول کر سن لے شفعے!“ رُحسے نے اُسے کہا۔ ”اگر تیرے ہاتھ میں واقعی کوئی جادو یا علم ہے تو یہ شریف گھروں پر مت چلا۔ تمہیں شاید معلوم ہو گا کہ یہ علم اُن کا بھی ہو جایا کرتا ہے۔“

”میری توبہ استاد!“ شفاعت نے کان کھڑک کر کہا۔ ”میں لالچ میں آکر یہ عمل کر تو بیٹھا ہوں لیکن میری حالت ٹھیک نہیں رہی۔“

رحما واپس چلا گیا۔ شفاعت نے مجھے سنایا کہ اُسی روز یعنی رُحسے کے آنے سے پہلے علی رضا شفاعت کے پاس آیا تھا اور اُسے بتایا کہ شکوری گھر سے غائب ہے۔ شفاعت کو تو معلوم ہی تھا۔ شفاعت نے اُسے

کہا کہ شکوری کو اُس نے غائب کیا ہے لیکن ذرا سی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ وہ معلوم کرے گا کہ کہاں پہنچ گئی ہے۔ شفاعت نے اُسے یہ بات اس لئے کہی تھی کہ اُس نے اُس سے پیشگی رقم لی ہوئی تھی جو شفاعت اُسے واپس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ علی رضا کو معلوم تھا کہ شفاعت عمل کر رہا ہے۔ لگے ہی روز کسی عورت کی کھاتی ہوئی لاش برآمد ہو گئی جسے سب انسپکٹر پہل داس نے شکوری کی لاش کہہ دیا۔ علی رضا کو معلوم تھا کہ یہ لاش شکوری کی نہیں۔ لاش کی برآمدگی کے بعد رات کو علی رضا بھر شفاعت کے پاس گیا۔ شفاعت نے اُسے بتایا کہ اُنس نے شکوری کو ڈھونڈ لیا ہے۔

”ایک بات بتاؤ۔“ میں نے پوچھا۔ ”کیا علی رضا کو تمہاری اصلیت کا علم ہے؟“

”نہیں۔“ شفاعت نے جواب دیا۔ ”وہ مجھے جگت کبیر جیسا سادھو سمجھتا ہے۔ آپ ذرا خیال رکھیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ بھی آپ کے سامنے آئے گا۔“

شفاعت نے علی رضا کو بتایا۔ ”میرے عمل سے لڑکی گھر سے نکل آتی تھی لیکن مجھے اشارہ نہ ملا۔ لڑکی پر کالا اثر تھا اس لئے وہ سیدھی آگے نکل گئی۔ میں اُس وقت ایک اور عمل میں ڈوبا ہوا تھا جب میں نے لڑکی والے عمل کی طرف توجہ دی تو مجھے اشارہ ملا کہ لڑکی آگے نکل گئی ہے۔ میں نے اپنا حساب کتاب جوڑا تو اشارہ ملا کہ لڑکی پوربھ کی طرف ایک ٹھکانے پہنچ گئی ہے۔“

شفاعت نے اپنی اوٹ پٹانگ اصطلاحوں میں بات کرتے ہوئے علی رضا کو رُجھے کا ٹھکانہ بتا دیا اور کہا کہ لڑکی وہاں سے گزر رہی تھی تو رُجھے کے آدمیوں نے پکڑ کر اُسے رُجھے کے حوالے کر دیا۔ شفاعت نے علی رضا کو رُجھے کا ٹھکانہ اس لئے بتا دیا تھا کہ وہ علی رضا کو پیسے واپس نہیں کرنا چاہتا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ رُجھے نے اُسے کہا تھا کہ

علی رضا کو کسی طرح اُس کے ٹھکانے تک پہنچا دو۔
”تم رُجھے کے پاس چلے جاؤ۔“ شفاعت نے اُسے کہا۔ ”وہ تمہیں لڑکی دے دے گا۔“

”میں لڑکی کو لے کر کیا کروں گا۔“ علی رضا نے کہا۔ ”میں نے قسم کھائی تھی کہ اُسے خراب کروں گا۔ اپنی قسم پوری کر کے لڑکی رُجھے کے پاس ہی رہنے دوں گا۔“

”مجھے یہاں تک ہی معلوم ہے کہ علی رضا رُجھے کے ٹھکانے کی طرف چلا گیا تھا۔“ شفاعت نے مجھے بتایا۔ ”اس کے بعد نہ رُجھے سے میری ملاقات ہوئی نہ علی رضا سے۔ اگر علی رضا کا دل میں ہوتا تو میرے پاس ضرور آتا۔ وہ رُجھے کے چھندے میں آگیا ہے۔“

”رُجھے نے اُسے قتل کر دیا ہوگا۔“ میں نے کہا۔
”میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ شفاعت نے کہا۔ ”وہ کہتا تھا کہ اُسے قتل نہیں کروں گا۔“

انگریز انسپکٹر جو جی پر مر رہا

اس جلی سادھو کا بیان یہیں پر ختم ہو گیا۔ میرے لئے یہ بالکل ضروری نہیں تھا کہ میں اس شخص کے سارے بیان کو صحیح مان لیتا۔ یہ جرائم کی دُنیا کے لوگ تھے۔ رحمانیشک خاندانی ڈاکو تھا لیکن شفاعت علی بڑا کا تیلان شخص تھا۔ اُس کی زبان میں ایسی چاشنی اور ایسا تاثر تھا کہ مجھ جیسا پتھر بھی متاثر ہو گیا۔

اگر شفاعت کا بیان صحیح تھا تو شکوری رُجھے کے پاس تھی۔ علی رضا کی گمشدگی کی بھی رپورٹ تھی۔ شفاعت نے بیان کے مطابق علی رضا بھی رُجھے کے پاس تھا یا اُس نے اُسے قتل کر دیا تھا۔
رُجھے سے لڑکی واپس لینے کے دو طریقے تھے۔ ایک یہ کہ میں اُسے

دوستانہ بینام بھیجتا کہ لڑکی مجھے دے دو اور میں کوئی کارروائی نہیں کروں گا۔ ڈاکوؤں کے ساتھ پولیس کسی طرح رابطہ قائم کر لیا کرتی تھی۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ میں رُحسے کے ٹھکانے پر چھاپہ مارتا۔ اس کا

مطلب تھا مقابلہ۔ اس صورت میں ایسا ہونا یقینی تھا کہ رُحسے لڑکی کو قتل کر دیتا۔ میں رُحسے سے بھیک مانگنے کے لئے تیار نہ تھا۔ البتہ یہ ہو چکا کہ ڈی ایس پی سے بات کروں گا اور اُس کے حکم کے مطابق کارروائی کروں گا۔

اس دوران ایک ایسا واقعہ ہو گیا کہ میں پولیس سے استعفیٰ دینے کے لئے تیار ہو گیا۔ میں صبح شفاعت کا بیان لے رہا تھا تو ڈسٹرکٹ پولیس کا ایک انگریز انسپٹر زیڈ۔ جی۔ ایونز آگیا۔ وہ وادی میں نہیں تھا میں بیان روک کر اُسے ملا۔ وہ اس علاقے میں بہن اور جیتل کا شکار کھیلنے آیا تھا اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرا تھا۔ وہ ایک تو یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ وہ میرے علاقے میں آیا ہوا ہے اور تھانے میں اُس کے آنے کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ اُسے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے ایک آدمی کی ضرورت تھی۔

وہ علاقہ شکار کا تھا۔ انگریز انسٹر اور راجے، ہمارا بے اور نواب شکار کھیلنے کے لئے آتے رہتے تھے، اس لئے شکاریوں کے ساتھ جانے والے آدمی مل جاتے تھے۔ یہ ایک پیشہ بن گیا تھا۔ میں نے انسپٹر ایونز سے کہا کہ میں کسی تجربہ کار آدمی کو ڈاک بنگلے میں بھیج دوں گا۔

میں نے اُس لڑکی (جو جی) کو تھانے بٹھایا ہوا تھا جس کی انگلی سے شکوری کی انگوٹھی برآمد ہوئی تھی۔ میں سناچکا ہوں کہ وہ گورے رنگ کی بڑی دلکش لڑکی تھی اور اُس کے قد کاٹھ میں تو اور زیادہ کشش تھی۔ چونکہ وہ شریف لڑکی نہیں تھی اس لئے اُس کے چہرے پر آنکھوں میں اور اُس کی مسکراہٹ میں گناہ کا تاثر بڑا صاف تھا۔ اس تاثر میں کچھ اور ہی کشش تھی۔

انسپٹر ایونز میرے ساتھ باتیں کر رہا تھا تو جو جی سامنے آگئی اُسے میں نے حراست میں تو نہیں لیا تھا، تھانے میں باند رکھا ہوا تھا۔ انسپٹر ایونز

نے اُسے دیکھا تو مجھ سے پوچھا کہ یہ کون ہے اور تھانے میں کیا کر رہی ہے۔ میں نے اُسے مختصر الفاظ میں بتایا۔

”مومن تو نہیں ہے۔“ اُس نے پوچھا۔

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”گواہ ہے۔ ہو سکتا ہے نادانستہ طور پر اس واردات میں ملوث ہو۔“

”بہت خوبصورت لڑکی ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”مستر ملک! تم نے نوٹ کیا ہو گا کہ ہندوستان کی عورتوں میں جو کشش ہے وہ ہماری انگریز عورتوں میں نہیں۔“

اُس نے خن کی باتیں شروع کر دیں اور جتنی دیر جو جی سامنے رہی وہ اُسے دیکھتا رہا۔

اُس کے جانے کے بعد میں نے اُسے۔ ایس۔ آتی سے جو پہلے اُسے۔ ایس۔ آتی نارائن کی جگہ مجھے دیا گیا تھا، کہا کہ وہ انسپٹر ایونز کے لئے کسی تجربہ کار آدمی کا بندوبست کرے اور اُسے ڈاک بنگلے میں اُس کے پاس چھوڑ آئے۔

میں پھر جلی سادھو شفاعت کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ اس دوران تھانے کے کئی مسئلے میرے سامنے آئے۔ ان کی طرف بھی توجہ دی اور دن گزر گیا۔ شام کے کھانے کے لئے میں گھر گیا اور رات کو تھانے میں آیا اور پھر شفاعت کو بٹھالیا۔ وہ بڑی کارآمد نشانہ بیاں کرا رہا تھا۔ بڑے اچھے سراغ دے رہا تھا۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ میں کمرے سے نکلا۔ اپنے آپ کو ذرا ٹھنڈی ہوا لگوانا چاہتا تھا۔ نرآمد سے سے نیچے اُترا تو احاطے کے گیٹ کی طرف سے کسی عورت کے گانے کی آواز آتی۔ وہ کسی سڑنال میں نہیں گارہی تھی۔ میں اُس طرف چلا گیا۔ وہ بلب کی روشنی میں آتی تو میں نے اُسے دیکھا۔ وہ جو جی تھی۔ اُس کے قدم ڈمک گارہے تھے۔ قدم رکھتی کہیں اور پڑنا کہیں اور تھا۔ اُس کی آواز بھی ڈمک گارہی تھی۔ وہ نٹے میں تھی۔

میں تو یہی دیکھ کر حیران ہو گیا تھا کہ جوجی کو تھالے کے اندر ہونا چاہیے تھا اور وہ باہر سے آ رہی تھی مگر یہ دیکھ کر میں پریشان ہو گیا کہ جوجی نے صرف مٹینس پہن رکھی تھی اور وہ بغیر شلوار کے تھی۔ میں نے آگے جا کر اُسے روکا اور غصے سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آ رہی ہے۔

”اے ہٹ راستے سے ہندوستانی تھانیدار!“ اُس نے نشے سے جھومتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں انگریز انفر کی ٹیم ہوں۔ ڈاک بنگلے سے آتی ہوں۔“ اُس نے اس قدر پی رکھی تھی کہ بڑی مشکل سے اُس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے تھے۔ ”ہٹ آگے سے۔ میں اب تھالے میں نہیں آؤں گی۔“ وہ گیٹ کی طرف مڑی۔

میں نے پیچھے سے اُس کے کندھے پر پکڑے اور اُسے زور سے اپنی طرف گھما کر اس سے زیادہ زور سے اُس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ وہ مجھ سے چھ سات قدم دور جا گری۔ میں چونکہ تھالے میں تفتیش کر رہا تھا اس لئے ایک ہیڈ کانٹیل اور چار پانچ کانٹیل میرے ساتھ جاگ رہے تھے۔ وہ سب دوڑے آتے جوجی اُبھڑ نہ سکی۔ وہ نکلی ہو گئی تھی۔ میرے کہنے پر ایک کانٹیل چادر اٹھا لیا جو اُس پر ڈالی اور اُسے اٹھا کر اندر لے گئے۔

”یہ باہر کس طرح چلی گئی تھی؟“ میں نے اپنے آدمیوں سے پوچھا۔

”کیا تم سب سو گئے تھے؟“

”اے سوامی جی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔“ ہیڈ کانٹیل نے کہا۔

سوامی بھرا نیا اے۔ ایس۔ آتی تھا۔ مجھے آگ لگ گئی۔ اُس کی یہ جرات کہ تھالے سے ایک شامل تفتیش لڑکی کو اپنے گھر لے گیا تھا؟

”اپنے گھر نہیں ملک صاحب!“ ہیڈ کانٹیل نے کہا۔ ”اے سوامی جی ڈاک بنگلے میں اُس گورے انسپکٹر کے پاس لے گئے تھے جو دن کو یہاں آیا تھا۔“

مجھے یاد آیا کہ انسپکٹر ایوز جوجی کی خوبصورتی سے بہت متاثر ہوا تھا اور اُس کو دیکھتا رہا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ اے۔ ایس۔ آتی اُس وقت تھالے

سے جوجی کو ساتھ لے گیا تھا جب میں اندر شفاعت کے ساتھ مصروف تھا۔ میں نے ہیڈ کانٹیل سے پوچھا کہ اُس نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟

ہیڈ کانٹیل کے پاس جھوٹ بولنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اُس نے صاف بتا دیا کہ اے۔ ایس۔ آتی نے اُسے کہا تھا کہ انگریز انسپکٹر نے اُسے کہا ہے کہ اس لڑکی کو وہ رات کو اُس کے پاس ڈاک بنگلے میں چھوڑ جاتے اور وہ اسے تھوڑی دیر بعد واپس بھیج دے گا۔ اے۔ ایس۔ آتی نے ہیڈ کانٹیل سے یہی کہا تھا کہ انسپکٹر ایوز انہیں اس تھالے سے ہٹا کر ترقیاں دلاتے گا۔

اے۔ ایس۔ آتی سوامی کو میں نے ہی کہا تھا کہ انسپکٹر ایوز کو شکار پر ساتھ لے جانے کے لیے ایک آدمی کا بندوبست کر دے۔ وہ ایک آدمی کو ساتھ لے کر ڈاک بنگلے میں گیا تھا۔ اُس وقت انسپکٹر ایوز نے اُسے کہا تھا کہ جوجی کو رات اُس کے پاس بھیج دے۔ وہ انگریز انفر تھا۔ سوامی نے اُس کی فرمائش کو حکم سمجھا۔ بعد میں سوامی نے مجھے یہی بیان دیا تھا۔ اُس کے لئے ایک انگریز انسپکٹر کی فرمائش کو ٹالنا ممکن نہ تھا۔ اس انگریز نے اُسے ترقی کا لالچ دیا تھا۔ سوامی نے مجھ سے اس لئے نہ پوچھا کہ میں نہیں مانوں گا۔ میں واقعی ایسی یہودہ بات نہ مانتا۔

اے۔ ایس۔ آتی سوامی اپنے گھر چلا گیا تھا۔ میں نے ایک کانٹیل سے کہا کہ وہ سوامی کو جگا کر لے آئے۔ جوجی بے سندھ بڑی تھی اور میں جل جھن رہا تھا۔

سوامی آگیا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ جوجی کو ڈاک بنگلے میں لے گیا تھا؟ اُس کی غلامانہ ذہنیت کی انتہا تھی کہ اس نے ایک انگریز انفر کی یہ مجرمانہ فرمائش پوری کی۔ میں نے غصے سے ہاگل ہو کر یہ مجرمانہ حرکت کی کہ سوامی جی کو پچھلے کمرے میں لے گیا اور اُسے پینا جو شروع کیا تو اُس وقت چھوڑا جب اُس میں فرش سے اُٹھنے کی ہمت نہ رہی۔ مجھے ایسی اتھارٹی حاصل نہیں تھی لیکن میں ذاتی غصہ بٹھڑا کر رہا تھا۔ میں نے اُسے اسی کمرے

میں بند کر دیا اور شفاعت سے پوچھ کر کھانے لگا۔
باقی رات شفاعت کے ساتھ گزرتی تھی۔ اُسے گرفتار نہ کیا۔ وہ
ابھی مشتبہ تھا۔ اُسے تھانے میں ہی رکھا۔

ایسی لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کروں گا

صبح طلوع ہوتی تو میں نے جوجی کو جگایا۔ نشہ اتر چکا تھا لیکن وہ پریشان
نہیں تھی۔ اُسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ ڈاک بنگلے سے تھانے تک کس طرح
آتی تھی۔ اُسے میرا ہتھ پڑ بھی یاد نہیں تھا۔ اُس نے بتایا کہ چھوٹا تھا نیند اُسے
ڈاک بنگلے میں لے گیا تھا۔ انسپکٹر ایونز نے اُسے کھلایا پلایا۔ وہ اردو بولتا
تھا۔ اُس نے جوجی سے کہا کہ وہ اُس کی میم ہے اور اُسے وہ اپنے ساتھ
انگلینڈ لے جاتے گا۔ جوجی کے لئے یہی اعزاز بہت بڑا تھا کہ اُسے ایک
انگریز انصر نے پسند کیا تھا۔ انگریز انصر نے کچھ دیر کے لئے اُسے اپنی میم
بنایا اور اُسے خوب شراب پلاتی۔ صاحب بہادر خود بھی زیادہ پی گیا اور سو
گیا جوجی نشتے میں وہاں سے نکل آئی۔ اُسے شلوار پہننے کی بھی ہوش
نہیں تھی۔

میں ڈاک بنگلے چلا گیا۔ انسپکٹر ایونز شکار پر جانے کے لئے تیار ہو
چکا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ رات کو وہ لڑکی اُس کے پاس آتی تھی؟
میرا موڈ دیکھ کر اُس نے مجھے حکم کے بیچے میں کہا کہ میں اُس سے کچھ نہ پوچھوں
میں نے اُس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ فرس پر جوجی کی شلوار پڑی تھی۔
”وہ شاید اس کے بغیر چلی گئی ہے۔“ اُس نے شلوار پاؤں سے میری
طرف کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ لے جاؤ اور یہاں سے نکل جاؤ۔“
میں شلوار اٹھا کر وہاں سے نکل آیا۔ تھانے آکر سوامی، ہیڈ کانٹیل
تین کانٹیلوں اور جوجی کو ساتھ لیا اور پہلی لاری سے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر
کو روانہ ہو گیا۔

وہاں پہنچ کر پہلے میں ڈی۔ ایس۔ پی کے پاس گیا۔ وہ انگریز تھا۔
اُسے بتایا کہ انسپکٹر ایونز نے یہ حرکت کی ہے۔ اُس نے سوامی اور جوجی
سے تصدیق کرائی۔ خطرہ تھا کہ انگریز ڈی۔ ایس۔ پی ایک انگریز انسپکٹر
کے خلاف کچھ نہیں کرے گا لیکن وہ اٹھا اور ہم سب کو ایس۔ پی کے پاس
لے گیا۔ ایس۔ پی نے ہم سب کے بیان لئے۔ سوامی نے میرے خلاف
شکایت کی کہ میں نے اُسے مارا بیٹھا ہے۔ ایس۔ پی نے مجھے ایک بار پھر
اندھ بلایا اور پوچھا کہ میں نے اسے مارا بیٹھا ہے؟

”اگر میں سروس میں نہ ہوتا تو اسے جان سے مار ڈالتا۔“ میں نے
کہا۔ ”میں ڈیوٹی، ڈسپن اور قانون کو اپنا ذاتی معاملہ سمجھا کرتا ہوں۔“
ایس۔ پی نے اُسی وقت حکم دے دیا کہ سب کو لاتن حاضر کرو اور
انسپکٹر ایونز جو پانچ دنوں کی چھٹی پر تھا، اُسے فوراً واپس بلانے کا حکم دیا۔
مجھے اُس نے کہا کہ میں واپس جا کر تفتیش مکمل کروں۔

اس کے بعد اٹھوا تری ہوتی اور محکمہ کارروائی یہ ہوتی کہ انسپکٹر ایونز
کو ان پکڑے سب انسپکٹر بنا دیا گیا۔ اے۔ ایس۔ پی سوامی کو سروس
سے نکال دیا گیا۔ ہیڈ کانٹیل کو کانٹیل بنا دیا گیا اور کانٹیلوں کو صرف تین
کی گئی۔ اس کارروائی میں دس بارہ دن لگ گئے تھے۔

میں اُسی روز شام کو واپس آ گیا تھا۔ تھانے میں پہنچا ہی تھا کہ شکوری
کا منگیتر آ گیا۔ وہ فوج میں ناکم تھا۔ اُس وقت کے فوجی خوبصورت جوان
ہوا کرتے تھے۔ جسم گٹھے ہوتے اور چہروں پر صحت اور تندہی کی چمک
ہوتی تھی۔ یہ شخص بھی دراز قد اور بڑے کٹش چہرے والا تھا۔ اُس کا نام
زیر تھا۔

”لڑکی کا کچھ پتہ چلا؟“ اُس نے رعب سے مجھ سے پوچھا اور اپنا
تعارف کرایا۔ ”میں اُس کا منگیتر ہوں۔۔۔۔۔ ناکم زیر احمد۔“
”کچھ سراغ تو ملا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لڑکی مل جائے گی۔ سننا
تھا تمہاری منگنی لوٹ چکی ہے۔“

”آپ نے ٹھیک سنا ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”میں ایسی لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کروں گا جو کسی کے ساتھ چلی گئی ہے۔“
 ”پھر تم اُس کے متعلق کیوں پوچھ رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
 ”خون کا رشتہ ہے؟“

”نہیں۔“ اُس نے کہا۔ ”لیکن میں اُسے ڈھونڈوں گا۔ وہ میری منگیتر تھی۔ اگر وہ مجھے لات مار کر کسی اور کے ساتھ چلی گئی ہے تو میں اپنی بے عزتی کا بدلہ لوں گا۔ اُسے قتل کروں گا۔ اگر اُسے زبردستی اغوا کیا گیا ہے تو میں اغوا کرنے والوں کو قتل کر دوں گا۔“
 ”جہاں دو میرے دوست!“ میں نے کہا۔ ”کیوں پھانسی چڑھنے کا بندوبست کر رہے ہو؟“

”مجھے میرے دوستوں نے رجسٹر میں اور گاؤں میں بھی طعنہ دیتے ہیں کہ تمہاری منگیتر تمہیں چھوڑ کر اپنی پسند کے کسی جوان کے ساتھ چلی گئی ہے۔ میں فوجی ہوں اور خاندانی آدمی ہوں۔ میں بے غیرت نہیں۔“
 آج کل کی تہذیب کے لوگ اس شخص کے جذبات اور ارادوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ دیہات کے لوگ سمجھتے ہیں۔ اُس زمانے میں تو غیرت پر لوگ مرٹے تھے۔ قتل کرتے اور قتل ہوتے تھے۔ یہ شخص دیہاتی بھی تھا فوجی بھی۔ انگریزوں کے دور میں فوجیوں کو فوجی بیوقوف کہا جاتا تھا۔ زبیر انہی فوجیوں میں سے تھا۔ اُس کا ارادہ بڑھا تھا۔ میں نے سوچا کہ لڑکی اس کے سامنے آگئی تو یہ شخص اُسے واقعی قتل کر دے گا۔ یہ سوچ کر میں نے اسے بتایا کہ شکوری کو کس طرح گھر سے نکالا گیا ہے اور شکوری نیک اور پاک لڑکی ہے۔

”میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔“ اُس نے کہا۔ ”اگر وہ واقعی نیک اور پاک ہے تو میرے گھر والے مانیں یا نہ مانیں، میں اُس کے ساتھ شادی کروں گا لیکن اُسے اغوا کرنے والوں کو نہیں چھوڑوں گا۔۔۔ میں کس طرح یقین کر سکتا ہوں کہ وہ نیک لڑکی ہے؟“

”میں نہیں یقین دلاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن تمہارے میں کوئی غلط حرکت نہ کرنا۔ لینے کے دینے پر مجاہدیں گے۔“
 ”میں آپ کو کوئی دھمکی نہیں دے رہا۔“ اُس نے کہا۔ ”میں کوئی حرکت کروں گا تو بھانگوں گا نہیں۔ آپ کو پریشانی نہیں ہوگی۔ آپ کے پاس آجاول گا اور کہوں گا کہ مجھے گرفتار کر لو۔“
 مجھے بالکل ضرورت نہیں تھی کہ میں اس شخص کے آگے اُس کی منگیتر کی صفاتی پیش کرتا یا اُسے اپنی تفتیش کی تفصیل سناتا۔ میں دراصل لڑکی کو تباہی سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے یہ یقین نہیں تھا کہ رُحمے رہزن کے پاس لڑکی پاک رہی ہوگی۔ میں نے شفاعت کو بلایا اور اُسے سادھو ہی ظاہر کیا۔ وہ سادھوؤں کے بہروپ میں تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ اس شخص کو بتاتے کہ لڑکی کہاں ہے۔

”رُحمے رہزن کے پاس۔“ شفاعت نے صرف اتنا کہا۔
 میں نے شفاعت کو بتایا کہ زبیر شکوری کا منگیتر تھا لیکن اس کے ماں باپ نے شکوری کو بدجنان سمجھ کر منگنی توڑ دی ہے اور اب زبیر اُسے قتل کرنا چاہتا ہے۔

شفاعت نے میرے کہنے پر اُسے صاف صاف بتا دیا کہ شکوری کو گھر سے کس طرح نکالا گیا اور رُحمے کے پاس وہ کس طرح پہنچی ہے۔
 زبیر کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں اس ڈاکو سے لڑکی کو چھڑانے کے لئے کیا کر رہا ہوں۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں چھاپہ مارنے کی سوچ رہا ہوں لیکن وہ لوگ لڑکی کو قتل کر دیں گے۔
 اُس نے شفاعت سے رُحمے کے ٹھکانہ کا معلوم کر لیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔
 ”دیکھ کافر کے بچے۔“ اُس نے شفاعت سے کہا۔ ”زمرہ رہنا ہے تو اتنی دُور نکل جاؤ جہاں میں نہ پہنچ سکوں۔“

”اُسے میں سزا دلاؤں گا جاتی!“ میں نے کہا۔
 ”پھر اُسے ساری عمر جیل میں ہی رکھنا۔“ نامک زبیر نے کہا۔

”باہر آئے گا اور مارا جائے گا۔ علی رضا کی زندگی بھی پوری ہو گئی ہے۔“
وہ فوجیوں کی طرح چلتا کھڑے سے نکل گیا۔ تب مجھے اپنی حماقت کا
احساس ہوا۔ میرے دماغ میں لڑکی کی عزت اور زندگی سمائی ہوتی تھی۔
اس کے علاوہ میرا دماغ تنک گیا تھا۔ مجھ سے اب حماقتیں ہورہی تھیں۔

فوجی جوان کی رگ پھڑکی

میں اس اطلاع کی توقع نہ ہوتے تھا کہ یہ شخص نامک زبیر احمد
لاپتہ ہو گیا ہے۔ مجھے ایسے نظر آکر ہوتا تھا کہ یہ فوجی فوجیوں والی روایتی بیوقوفی
کرنے کا اور رُحے کے پاس جا پہنچے گا اور اُس پر بھی رعب جھاڑے گا،
پھر زحما سے گم کر دے گا۔

وہ دن گرا، رات گزری اور اگلادن طلوع ہوا۔ میں نے ڈی۔ ایس پی
کے لئے رپورٹ تیار کر لی تھی۔ دوپہر کا وقت ہو گا کہ نامک زبیر آیا۔
”میں لڑکی کو لے آیا ہوں۔“ اُس نے کہا۔
”کہاں سے؟“

”رُحے رہزن سے۔“ اُس نے کہا۔ ”میں بہت حیران ہوں کہ
ڈاکو اور رہزن ہو کر وہ دوسروں کی عزت اور غیرت کو سمجھتا ہے۔“
وہ معلوم نہیں کتنا حیران تھا، میں بہت زیادہ حیران ہوا کہ رُحے نے
اُسے اتنی خوبصورت لڑکی دے دی ہے۔ اُس نے مجھے سنا یا کہ وہ رُحے
کے گھر پہنچ گیا اور رُحے اُسے مل گیا۔ زبیر اپنے ساتھ ایک خنجر لے گیا تھا۔
اُس نے رُحے کو بتایا کہ وہ کون ہے اور کیوں آیا ہے۔ رُحے نے اُسے کہا
کہ لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاؤ لیکن وہ یہاں سے جاتی نہیں۔ زبیر نے
بڑے رعب سے کہا کہ وہ رُحے کو بھی اور لڑکی کو بھی قتل کر دے گا رُحے
نے اُسے بتایا کہ لڑکی نیک اور بالکل صاف ہے اور اُسے رُحے نے اپنی
بیٹیوں کی طرح رکھا ہوا ہے۔

”تم جھوٹ بولتے ہو۔“ زبیر نے کہا۔
”میری بات کان کھول کر سن لے فوجی جوان!“ رُحے نے اُسے
کہا۔ ”تمہیں ابھی معلوم نہیں کہ تم کہاں بیٹھے ہو۔ یہاں انگریزوں کی نہیں
میری بادشاہی ہے۔ تمہاری بوٹی بوٹی غائب کر دی جاتے گی اور کسی کو پتہ
نہیں چلے گا۔۔۔۔۔ تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں تم سے ڈر کر اپنی اور لڑکی کی صفائی
پیش کر رہا ہوں۔ جا، اپنی پوری پلٹن لے آ، تجھے لڑکی نہیں ملے گی اور میں
غائب ہو جاؤں گا۔ پولیس کو لے آ اور لڑکی کو لے جا۔۔۔۔۔ کہ بہت بیوقوف
انسان! میں مرد ہوں اور مرد کی عزت اور غیرت کو سمجھتا ہوں تیری منگیتر
موتیوں کی طرح صاف ہے۔“

زبیر ٹنڈا پڑ گیا۔ تب رُحے نے اُسے بتایا کہ لڑکی کس طرح اُس کے
پاس پہنچی ہے۔ اُس نے دیکھا کہ لڑکی معصوم اور عبادت گزار ہے تو اُس
نے لڑکی سے کہا کہ چل تجھے تیرے گھر چھوڑ آؤں لیکن دو مہینے دن دیر ہو گئی۔
رُحے نے ایک روز لڑکی سے کہا کہ آج وہ اُسے اُس کے باپ کے حوالے
کرنے جاتے گا مگر لڑکی نے انکار کر دیا۔ کہنے لگی کہ وہ گاؤں میں کس منڈے
جلتے گی۔ کون مانے گا کہ اُسے کسی اور ہی اثر سے گھر سے نکالا گیا ہے۔
سب اُسے بدچلن کہیں گے۔ اُس کی منگنی ٹوٹ چکی ہوگی۔ بدنامی کے صدمے
سے اُس کا باپ مر جاتے گا۔ وہ نہیں جلتے گی۔ لوگ اُس پر انگلیاں اٹھائیں
گے۔ کوئی خاندان اُس کا رشتہ قبول نہیں کرے گا۔

رُحے نے لڑکی کو اپنی بیوی کے حوالے کر دیا۔ اُس نے زبیر سے کہا
کہ اُس کے لئے لڑکیوں کی کمی نہیں۔ وہ لڑکیوں کو بیچنے کا کاروبار بھی نہیں
کرتا۔ وہ شکوری کو اپنے پاس رکھنے پر آمادہ نہیں تھا لیکن لڑکی وہاں سے
لکھی نہیں تھی۔ کہتی تھی کہ مجھے مار ڈالو یا یہیں پڑی رہنے دو۔

رُحے نے کسی کو آواز دی۔ ایک آدمی دوڑ آیا۔ رُحے نے اُسے
کہا کہ اُس لڑکی کو میرے پاس بھیج دو۔ دو چار منٹ بعد شکوری کمرے میں
داخل ہوئی۔ زبیر کو دیکھ کر چھینپ گئی۔ رُحے نے اُسے کہا کہ زبیر اُسے لینے

آیا ہے۔
 ”مجھے لے جا کر کیا کرو گے؟“ شکوری نے کانپتی ہوتی آواز میں کہا
 — ”مکون مانے گا کہ میں بے گناہ اور معصوم ہوں؟“
 ”شکوری بیٹی!“ — ”رحمے نے کہا —“ اسے بتاؤ کہ تمہیں یہاں کس
 طرح رکھا گیا ہے اور تم یہاں سے کیوں نہیں جاتی تھیں؟“
 شکوری نے تفصیل سے بتایا۔

”میری سُن فوجی بھاتی!“ — ”رحمے نے زبیر سے کہا —“ میں ڈاکو ہوں
 اس لئے میری ہر بات کو تم مٹی میں ملا دو گے لیکن میں انسان بھی ہوں۔ میں
 نے دنیا کے وہ رنگ دیکھے ہیں جو تم نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں
 گے نہ کبھی دیکھو گے۔ تم نے پہلے کبھی سنا تھا کہ ایک لڑکی پر ایک آدمی نے
 ایک میل دوڑ بیٹھ کر ایسا اثر ڈالا کہ وہ اپنے پاؤں پر چل کر اُس کے پاس
 پہنچ گئی؟۔۔۔ لیکن خدا کی طاقت سب سے بڑی ہے۔ یہ لڑکی کہتی ہے کہ
 یہ اللہ رسول اور قرآن پاک کے سوا کسی کو نہیں مانتی تھی۔ یہ یہاں بھی نماز
 پڑھتی رہی ہے۔ اس پر کالے جادو کا اثر تو ہوا لیکن اللہ کے کلام کا اثر کوئی
 نہیں ہٹا سکتا۔ اللہ نے سبب بنایا۔ یہ سادھو کے پاس آئی۔ اللہ نے ایک
 اور آدمی بھیج دیا۔ وہ اسے لے گیا پھر اللہ نے چار آدمی بھیجے اور لڑکی یہاں
 آگئی۔ اگر یہ اپنی مرضی سے آئی ہوتی تو آج یہ میری داشتہ ہوتی لیکن یہ
 ہوش میں آگئی اور مجھے پتہ چل گیا کہ یہ کس طرح آئی ہے۔ میں نے اُس آدمی کو
 بھگا دیا اور یہ امانت رکھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس لڑکی کا علم کامل ہے۔ اس پر
 جادو چل سکتا ہے، اسے جادو نقصان نہیں دے سکتا۔“

زبیر نے مجھے بتایا کہ ”رحمے کو وہ صرف ڈاکو سمجھتا تھا لیکن اُس کی باتیں
 سُن کر اس کا عقد ٹھنڈا ہو گیا۔ شکوری کے انسو بہہ رہے تھے۔“

”میں تمہیں یہ بھی بتا دوں!“ — ”رحمے نے زبیر سے کہا —“ جس سادھو
 نے اس پر اپنا جادو چلایا ہے وہ اپنے ہی جادو کا شکار ہو گا۔ وہ اس عمل کو
 صحیح طریقے سے نہیں کر سکا۔ وہ آگے کا سبق جانتا ہی نہیں۔ وہ بہت بُری

موت مرے گا۔ میں نے ایسے واقعات پہلے بھی دیکھے ہیں۔ مجھے معلوم ہے
 وہ اس وقت کہاں ہے۔ اُس پر اپنے ہی جادو کا اٹنا اثر شروع ہو چکا ہے۔
 اس اثر نے اُسے تھانیدار کے قدموں میں جٹا دیا ہے۔“
 ”تم لڑکی کو گھر کیوں نہیں چھوڑ گئے؟“ — ”زبیر نے پوچھا —“ زبردستی
 لے آئے؟“

”انگریزوں کے راشن اور وُردی نے تمہاری عقل مار دی ہے۔“
 ”رحمے نے کہا —“ میں لڑکی کو بدنامی سے بچانے کی سوچتا رہا۔ اگر میں اسے
 زبردستی اٹھا کر رات کو تمہارے گاؤں چھوڑ آتا تو سارا گاؤں کہتا کہ خود
 گئی تھی خود آگئی ہے میں اسے منہ دار کے حوالے کر آتا اور سو سو قسمیں کھاتا
 کہ اسے میں نے بہن اور بیٹی بنا کر رکھا تھا تو سب کہتے کہ ڈاکو کے ساتھ اتنے
 دن گزار آتی ہے۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ تمہارے تھانیدار کو کو بیٹیاں بھیجوں
 کہ لڑکی کو لے جاتے لیکن پتہ چلا کہ تھانیدار نیا آیا ہے۔ اُسے میں نہیں جانتا۔
 اللہ نے لڑکی پر کرم کیا ہے کہ تم آگے ہو۔ اگر تم واقعی غیرت والے مرد ہو
 تو اسے لے جاؤ اور اس کے ساتھ شادی کرو۔ گاؤں والوں کے مُنہ
 بند کر دو۔“

”میں اسے لے جاؤں گا۔“ زبیر نے کہا — ”اور ساری دنیا سے
 کہلاؤں گا کہ زبیر خاندانی مرد ہے۔“

فوجی جوان کی دوسری رات پھر ٹک اُٹھی۔ اُس نے لکڑا کر کہا کہ سنگتی
 ٹوٹ چکی ہے لیکن یہ میری منگیتر ہے۔ میں اس کے ساتھ شادی کروں گا خواہ
 زمانہ میرے خلاف ہو جائے۔

”... لیکن دو غول میرے ہاتھ پر لکھ دیتے گئے ہیں۔“ اُس نے کہا
 — ”ایک سادھو کا اور دوسرا علی رضا کا خون۔“

رحمانس پٹا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ زبیر اور شکوری سے کہنے لگا کہ میرے
 ساتھ آؤ۔ وہ انہیں ایک کمرے سے گزار کر ایک اور کمرے کے دروازے
 پر لڑکا۔ وہ دیہاتی طرز کا کچا مکان تھا اور یہ ”رحمے کا عارضی ٹھکانہ تھا۔ اُس نے

دروازہ کھولا۔ یہ کوٹھڑی بھی جو نیم تاریک تھی۔ دروازہ پورا کھلا تو اندھیرا کم ہو گیا۔ کوئی آدمی کراہ رہا تھا۔ رُحاً آگے بڑھا اور اس آدمی کو پاؤں سے پکڑ کر گھسیٹا اور دروازے تک لے آیا۔

”پہچانو اسے“ اُس نے زبیر اور شکوری سے کہا۔

وہ علی رضا تھا۔ اُس کے ہاتھ پیٹھ پیچھے بندھے تھے۔ چہرہ لاش کی طرح ہو گیا تھا۔ زبیر اور شکوری نے اُسے مشکل سے پہچانا۔

”اسے کیا قتل کرو گے“ رُحے نے زبیر سے کہا۔ ”یہ پاگل ہو

چکا ہے۔ میں اسے اس کے گاؤں میں پھینک دوں گا۔ اس کی باقی عمر اسی حالت میں گزرے گی۔ اس نے اس لڑکی پر جادو چلوایا تھا۔ اس نے ایک بار میری ٹخری کی تھی.... اسے قتل نہ کرنا۔ اسے دنیا میں سزا بھگتے دو۔ یہ میرے پاس آیا تھا۔ کہتا تھا کہ یہ لڑکی میرے حوالے کر دو.... بدقسمت انسان؟“

علی رضا انکھیں پھاڑے ان تینوں کی طرف دیکھتا رہا جیسے ان کے ساتھ اُس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ رُحے نے اُس کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کیا تھا کہ اُس کا دماغ بیکار ہو گیا تھا۔

یہ اس تھکانے میں میرے آنے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ علی رضا پولیس کا ٹخبر بنا ہوا تھا۔ اُس نے کسی وقت ٹخبری کی تھی کہ آج رات رُحما فلاں گاؤں میں ہے۔ رُحما پولیس کو مطلوب تھا۔ پولیس چھاپہ مارنے آتی مگر رُحے کو پہلے اطلاع مل گئی تھی۔ وہ نکل گیا۔ اُسے کسی نے بتایا کہ ٹخبری علی رضانا نے کی تھی۔ اب علی رضا رُحے کے پھندے میں آ گیا تھا۔ اُس نے اس سے ٹخبری کا بڑا اچھا نیک انتقام لیا تھا۔

لاش محلے پر گرتی

زبیر شکوری کو اپنے ساتھ لے آیا۔ اُس نے شکوری سے کہا کہ وہ اب لوگوں کی باتیں نہ سنے، اللہ میں دھیان رکھے۔ زبیر نے اپنے ماں باپ سے

اور شکوری کے ماں باپ سے کہہ دیا کہ وہ شکوری کے ساتھ شادی کرے گا۔ زبیر کا یہ بیان سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ میرا کیس ختم ہو گیا ہے۔ زبیر نے مجھے کہا کہ میں اس سادھو کو اور واحدی کو سزا دلاؤں۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اب کسی کو بھی سزا نہیں دلا سکتا کیونکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں کر لڑکی کو کسی پراسرار اثر سے گھر سے نکالا گیا تھا۔ سادھو کا اپنا بیان کوئی وزن نہیں رکھتا۔ واحدی کے خلاف کوئی ثبوت اور شہادت نہیں، اور کیس تو یہیں پر ختم ہو گیا ہے کہ لڑکی اپنے گھر میں ہے، کسی اور کے قبضے سے برآمد نہیں ہوتی۔

”کیا ثبوت ہے کہ وہ کسی اور کے قبضے میں رہی ہے؟“ میں نے کہا۔ ”رُحما کورٹ میں بیان دینے نہیں آئے گا۔ آئے گا تو دوسرے کیسوں میں گرفتار ہو جائے گا.... سوچو زبیر بھائی! میں کیس کورٹ میں لے بھی جاؤں تو ہر پیشی پر لڑکی کو کورٹ میں جانا پڑے گا۔ وہاں صفائی کے وکیل یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ لڑکی اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ چلی گئی تھی، اور اب بدنامی سے بچنے کے لئے ملزموں پر جھوٹے الزام لگا رہی ہے۔“

زبیر سمجھ گیا۔ میرے لئے ایک کارروائی ضروری تھی۔ وہ میں نے رات کو کی شکوری کا بیان ضروری تھا۔ میں رات کو اُن کے گھر گیا۔ نمبردار کو ساتھ لیا اور شکوری کا بیان لیا۔ اُس نے وہی بیان دیا جو میں پہلے سن چکا تھا لیکن میں نے ایسا بیان لکھا جس سے میری پوریشن بھی ٹھیک رہی اور لڑکی کی عزت پر بھی حرف نہ آیا۔ لڑکی کے دستخط کر لے اور نمبردار کا انگوٹھا لگوا دیا۔

میں نے دوسرے دن یہ فیصلہ کیا کہ خود ہی ڈی۔ ایس۔ پی کے پاسنی چلا جاؤں اور اُسے اس کیس کا انجام بتا کر حکام لے لوں۔ اتنے میں نمبردار آ گیا۔ کہنے لگا کہ علی رضا بڑی بُری حالت میں واپس آ گیا ہے اور اُسے چار پانی پر ہڑال کر لارہے ہیں۔ نمبردار نے بتایا کہ رات کو وہ اپنے دروازے کے آگے بے ہوش پڑا تھا۔ اٹھا کر اندر ڈالا۔ اب ہوش میں ہے۔

چار پائی آتی تو اُس پر جیسے لاش پڑی تھی، مجھے نہ سوچا کہ یہ کیس تو مجھے لینا ہی پڑے گا اور نہ جسے کے ساتھ میری ٹکر ہوگی۔ میں نے علی رضا سے پوچھا کہ وہ بیان دے سکتا ہے؟ اُس نے اشارہ کیا کہ میں کان قریب کروں۔ میں اُس پر ہچک گیا۔

”میں نے انہیں کہا تھا کہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔“ علی رضا نے سرگوشی کی۔ ”یہ مجھے یہاں لے آتے ہیں، میری کوئی عرض رپورٹ نہیں۔ آپ پرچہ نہ لکھیں اور انہیں کہیں مجھے ہسپتال لے جاتیں۔“

میں نے اُس کے باپ سے پوچھا تو اُس نے مجھے کہہ دیا کہ وہ پرچہ نہیں کرائے گا۔ میں نے انہیں کہا کہ چار پائی اٹھاؤ اور تھانے کے احاطے سے نکل جاؤ۔ اُسے نمبر دار کے کہنے پر تھانے میں لاتے تھے۔ اللہ نے کرم کیا کہ اس کیس سے بھی میں بچ گیا۔ میں اُسی روز بیس میل دُور ڈی۔ ایس۔ پی کے پاس چلا گیا اور اُسے سارا کیس سنایا۔ وہ بڑی سخت طبیعت کا افسر تھا لیکن ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ کیس بند کر دو۔

”اور اُس لاش کا کیا بنا؟“ ڈی۔ ایس۔ پی نے اُس لاش کے متعلق جو کھاتی ہوتی برآمد ہوتی تھی اور جسے شکوری کی لاش کہہ دیا گیا تھا، حکم دیا۔ ”وہ تمہارے علاقے سے برآمد ہوتی تھی۔ اس کی تفتیش کرو۔ وہ عورت ضرور قتل ہوتی ہے۔“

میں اس لاش کی مصیبت گلے ڈال کر واپس آ گیا۔ میں نے واحدی اور نفیر کو حوالات میں بند کر رکھا تھا، جو جی اور شفاعت علی کو ویسے روک رکھا تھا۔ آتے ہی انہیں چھٹی دی۔ منگنی کی انگوٹھی شکوری کو دینے کے لئے رکھ لی۔ سادھو کو میں نے روک لیا۔ اسے میں اپنا نمبر بنا ناچاہتا تھا۔ وہ تو میرا دوست بن چکا تھا۔ بڑا ذہین آدمی تھا۔

میں نے اُسے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ ایک پیچیدہ کیس خود ہی میرے سر سے اتر گیا ہے لیکن وہ لاش میرے گلے پڑ گئی ہے۔ اگر وہ عورت قتل ہوتی ہے تو کسی اور تھانے کے علاقے میں قتل ہوتی ہوگی لیکن برآمد میرے

علاقے سے ہوتی ہے اس لئے تفتیش مجھے کرنی پڑے گی۔

شفاعت نے عادت کے مطابق میری ران پر ہاتھ مارا اور بولا۔ ”مجھے پوچھو۔“ اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”میں بتاؤں گا وہ لاش کس کی تھی۔ قتل کی وجہ بتا دوں گا۔ قاتل کی نشاندہی مشکل ہے لیکن آپ اُسے پکڑ لیں گے۔“

اُس نے ایک اور عجیب و غریب کہانی سنا ڈالی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میرا کام ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ بہر حال مجھے خوشی ہوئی کہ اُس لاش کا معرہ حل ہو جائے گا جو میرے گلے پڑ گئی تھی۔

وہ ضد کی بڑی سخت تھی

شفاعت علی عرف شفا میرے ساتھ اتنا بے تکلف ہو چکا تھا جیسے اُسے یاد ہی نہ رہا ہو کہ وہ نو سرباز اور عادی مجرم ہے اور میں محتسب دار ہوں۔ میں نے اُس کی بے تکلفی کو قبول کر لیا۔ مجھے اُس کی دوستی کی ضرورت تھی۔ اس سے مجھے یہ فائدہ ہوا تھا کہ اُس نے مجھے ایسی کہانی سنا ڈالی جس سے مجھے اُس لاش کی تفتیش کے لئے جو کھاتی ہوتی برآمد ہوتی تھی، بڑے قیمتی سراغ مل گئے۔ اُس نے جو داستان سنائی وہ میں اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔

یہ تو آپ کو سنا چکا ہوں کہ اُس نے سادھوؤں کا بڑا کامیاب روپ دھار رکھا تھا اور اُس کی اداکاری کامیاب تھی۔ اپنے استاد سے اُس نے کالے علم کے دو چار کمرے بھی سیکھے تھے۔ باقی کام اُس کی زبان کرتی تھی۔ اس سے اُس نے خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔ اُس نے مجھے سنایا کہ تقریباً تین چھینے گزرے، اُس کے پاس دو مسلمان عورتیں آئیں۔ ایک کی عمر چالیس سال سے کچھ اوپر تھی اور دوسری تیس سال سے کم ہوگی۔ اُس کی جوانی عروج پر تھی۔ دلکش رنگ کی خوب صورت عورت تھی۔ دوسری جو بڑھاپے میں داخل

ہو چکی تھی، خوبصورتی میں کم نہیں تھی۔ اس عمر میں بھی دل کو اچھی لگتی تھی۔
 دونوں سبکی بہنیں تھیں۔ اُن کے کپڑے اور چال ڈھال بتا رہی تھی کہ
 اونچے زمیندار خاندان کی ہیں۔ وہ ٹوٹوں پر آتی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کا نوکر
 تھا۔ شفاعت نے اُنہیں عزت سے بٹھایا اور پوچھا کہ وہ کیوں آتی ہیں۔
 ”آپ کی شہرت سن کر آتی ہیں“ بڑی بہن نے کہا۔ ”ہمارے اپنے
 پیر ہیں۔ ہم اُن کے ہاں سلام کے لئے یا مزاروں اور خانقاہوں پر جایا کرتی
 ہیں کسی سادھو یا سنیاسی کے پاس کبھی نہیں گئیں۔ کام ایسا اڑا ہے کہ آپ
 کے دروازے پر آتی ہیں۔“
 ”ہم آپ کے پیروں کی برابر ہی نہیں کر سکتے۔“ شفاعت نے سادھو
 سنیاسیوں کی طرح کہا۔ ”جو سیوا کر سکتے ہیں وہ ضرور کریں گے۔ دل میں جو
 مراد ہے بتا دو۔ بات اگر سزا کی ہے تو راز رہے گی۔ تمہارا پردہ ہمارا اپنا
 پردہ ہے کہو۔۔۔ بولو، ایسا کیا کام اڑا ہے؟“
 ”آپ جو کہیں گے ہم حاضر کریں گی۔“ بڑی بہن نے کہا۔ ”کام ہو
 گیا تو اور بھی خدمت کریں گی۔۔۔ بات یہ ہے کہ میرے دو بیٹے ادا ایک بیٹی
 سے تینوں جوان ہیں۔ بڑے بیٹے کی شادی ہو چکی ہے۔ اب بیٹی کی بات
 پتی کی ہے۔ منگنی بھی کر دی ہے۔ لڑکے والے انگوٹھی پہنا گئے ہیں کپڑے
 بھی دے گئے ہیں لیکن لڑکی ہماری عزت خاک میں ملانے پر تلی ہوئی ہے۔
 کہتی ہے میں اس لڑکے کو قبول نہیں کروں گی۔“
 لڑکیوں کی پسند اور ناپسند کو آج بھی کم ہی دیکھا جاتا ہے۔ شہروں میں
 لڑکیوں کو کچھ آزادی مل گئی ہے۔ ہماری جوانی کے دور میں لڑکی کو میرٹ بکری
 سمجھا جاتا تھا۔ ماں باپ جس کے ساتھ چاہتے، نکاح بڑھا کر چلا کرتے۔ دیہات
 میں تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ لڑکی اپنی پسند کی شادی کرے گی۔
 یہ الگ بات ہے کہ خود سزا اور دلیر لڑکی اپنی پسند کے آدمی کے ساتھ گھر سے
 بھاگ جاتی تھی، نتائج خواہ کچھ ہی ہوں۔
 شفاعت جس خاندان کی لڑکی کی بات سن رہا تھا وہ اُن بڑے

زمینداروں کا خاندان تھا جو اپنے گاؤں پر حکومت کیا کرتے تھے۔ اُن کی
 حلیوں اور چہ بڑوں میں جو بدی ہوتی تھی اس پر پردے پڑے رہتے
 تھے۔ آج بھی ایسے ہی ہوتا ہے۔
 ”کیا لڑکی ایسی حیات کرے گی کہ نکاح کے وقت کہہ دے کہ وہ
 اس دلہا کو قبول نہیں کرتی؟“ شفاعت نے پوچھا۔
 ”لڑکی سرکش ہے۔“ اُس کی ماں نے جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے وہ
 ایسا ہی کرے۔ اگر اُس نے ایسا کیا تو اُس کے بھائی وہیں اُسے قتل کر
 دیں گے۔ میرے دونوں بیٹے بہت دلیر اور غیرت مند ہیں۔۔۔ میرے بیٹوں
 کو ابھی پتہ نہیں چلا۔ ابھی یہ بات مجھ تک ہے یا میری اس بہن کو معلوم
 ہے۔ لڑکی کہتی ہے کہ وہ ڈولی میں بیٹھ کر چلی جائے گی لیکن اس آدمی کو
 خاوند نہیں مانے گی۔ اُس کے گھر آباؤ نہیں ہوگی۔“
 ”وہ ضد کی بڑی سخت ہے۔“ لڑکی کی خالہ نے کہا۔ ”وہ جو کہہ
 رہی ہے کہہ کر بھی دکھا دے گی۔“
 ”گاؤں میں ہی نہیں سارے علاقے میں ہمارے خاندان کی عزت
 ہے۔“ لڑکی کی ماں نے کہا۔ ”ہمارے خاندان کا رعب داب ہے۔
 اگر لڑکی نے شادی کے بعد ایسے ہی کیا جیسے وہ کہتی ہے تو سارا علاقہ ہم پر
 انگلیاں اٹھائے گا۔“
 ”جیسے وہ چاہتی ہے اُس کے ساتھ لڑکی کی شادی نہیں ہو سکتی؟“
 شفاعت نے پوچھا۔
 ”یہ تو وہ بتاتی ہی نہیں کہ کسے چاہتی ہے۔“ ماں نے جواب دیا۔
 ”لیکن منگنی ہو چکی ہے۔ ہم منگنی توڑ کر ساری برادری میں ذلیل نہیں ہو سکتے
 آپ جانتے ہیں کہ منگنی توڑنے سے ہمیشہ کی دشمنیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور
 فدا فراسی بات پر خون خرابے شروع ہو جاتے ہیں۔“
 ”مجھے بتاؤ کہ کیا ہے؟“
 ”سب تعویذ بیکار ہو گئے ہیں۔“ ماں نے کہا۔ ”سنا ہے آپ

کے پاس دوسرا علم ہے۔ کوئی ایسا بند و بست کریں کہ لڑکی کا دماغ ہمارے قبضے میں آجائے اور وہ اپنے منگیتر کو قبول کر لے۔ اپنی بے عزتی کے علاوہ دوسرا خطرہ یہ نظر آ رہا ہے کہ بیٹی نے ایسی ویسی حرکت کی تو میرے بیٹے اپنی بہن کو بخشیں گے نہیں، وہ اُسے فوج کے بھینک دیں گے اور چھائی چڑھ جائیں گے۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ شفاعت نے کہا۔ ”آج شام تک یا کل صبح لڑکی کے جسم سے اُترتی ہوئی قیض مجھے دے دینا۔ خود نہ آنا ہو تو نہ آنا، لو کہ کے ہاتھ بھیج دینا۔ خیال یہ رکھنا کہ قیض اُس کے جسم سے اُترے لیکن دھلے نہیں۔“

وہ شفاعت کو نذرانہ دے کر چلی گئیں۔

ممتاز، محبت اور موت

اگلی صبح ان کا نوکر لڑکی کی قیض لے آیا۔ شفاعت نے نوکر سے کہا کہ لڑکی کی ماں کو کل بھیج دینا۔ اُن کا گاؤں اُس جگہ پر تھا جہاں میرے علاقے کی حد ختم ہوتی تھی۔ سا دھو میرے تھانے کے علاقے میں تھلا دو ہاں سے لڑکی کا گاؤں چھ ساڑھے چھ میل دُور تھا۔

دوسرے دن لڑکی کی ماں اور خالہ آ گئیں۔ لڑکی کا نام ممتاز بیگم تھا۔ شفاعت کا لے علم کے جوگزہ جانتا تھا وہ رات کو اُس نے قیض سامنے رکھ کر آزماتے اور اپنے علم کے مطابق حساب کتاب جوڑا۔ اُس نے بکرے کے شانے کی بڈی پر خانے سے بناتے اور اُن پر کچھ ہندسے اور حرف لکھے ”یہ بڈی اپنے مکان کی دیہیز کے ساتھ باہر کی طرف زمین میں دبا دینا۔“ شفاعت نے اُنہیں کہا۔ ”لڑکی تین چار مرتبہ اس کے اُوپر سے گزیرے گی تو اُس کا دل تہا سے قبضے میں آجائے گا۔“

شفاعت نے ممتاز کی ماں کو دو تعویذ بھی دیئے جنہیں وہ نقش کرتا تھا۔

یہ دونوں تین دنوں کے وقفے سے لڑکی کو پانی میں گھول کر بلانے تھے۔ شفاعت نے اُن سے چند روپے وصول کئے اور وہ دونوں چلی گئیں۔ وہ آٹھ نوروز بعد شفاعت کے پاس گئیں۔ کہنے لگیں کہ لڑکی پر اور تو کوئی اثر نہیں ہوا، صرف یہ اثر ہوا ہے کہ اُس نے بتا دیا ہے کہ وہ کیے چاہتی ہے۔

”اُس آدمی کے ساتھ ہم اپنی بیٹی کی شادی نہیں کر سکتے۔“ ممتاز کی ماں نے کہا۔ ”ایک تو ذات دوسری ہے جو ہماری ذات سے ایک درجہ کم ہے اور دوسری وجہ آپ کو معلوم ہے۔ منگنی ہو چکی ہے۔“

”لڑکی اس آدمی سے ملتی ملاتی ہو گی؟“

”ملتے کبھی دیکھا نہیں۔“ ممتاز کی ماں نے کہا۔ ”گاؤں میں کسی کی کوئی حرکت چھپی نہیں رہ سکتی۔ میں نے اپنی لڑکی کے متعلق ایسی ویسی بات کبھی نہیں سنی۔ وہ کوئی بُرا آدمی بھی نہیں۔“

شفاعت علی کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ لڑکی کا چال چلن کیسا تھا اور وہ آدمی کیسا تھا جسے وہ چاہتی تھی۔ لڑکی کی ماں اور خالہ اُس کی گاہک یا اُس کی ساتل تھیں۔ ان سے اُس نے روپیہ پیسہ بٹورنا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں کالا جادو تھا یا نہیں، اُس کی زبان میں جادو تھا جو اُس نے مجھ پر بھی چلا لیا تھا۔ وہ ممتاز کی ماں اور خالہ کے ساتھ اس قسم کی باتیں کرتا رہا جن سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ اُس نے لڑکی کی قیض پر جو عمل کیا ہے اور اُس نے جو نقش دیئے تھے، ان کا اثر ہوا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ لڑکی نے اُس آدمی کا نام بھی بتا دیا ہے جس کے ساتھ وہ شادی کرنا چاہتی ہے۔

”وہ جو بڈی میں لے دیہیز کے قریب دہانے کے لئے دی تھی وہ اپنا کام کرے گی۔“ شفاعت نے کہا۔

”ہم چاہتی ہیں کہ آپ کوئی ایسا جادو چلائیں جس سے لڑکی کا دل ہمارے قبضے میں آجائے۔“ ممتاز کی ماں نے کہا۔ ”اب لڑکی نے یہ

کہا ہے کہ جب تک یہ آدمی زندہ ہے اور وہ میرے سامنے موجود ہے، میں کسی اور خاندان کے گھر آباد نہیں ہوں گی۔“ ماں نے دھیمی آواز میں کہا۔
 ”اس شخص کو زمین کے تختے سے اٹھا دینا ہمارے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔ میرے بیٹوں کو پتہ چل گیا تو وہ اُسے زندہ نہیں چھوڑیں گے لیکن آپ میری بیٹی کا دماغ میخ کر دیں تو یہ ناحق خون نہیں ہوگا۔ میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ مجھے اپنے بیٹوں کا غم کھانا ہے۔ وہ اس شخص کو قتل کر دیں گے اور پچھانی چڑھ جائیں گے۔“

شفاعت نے انہیں ایک اور نقش لکھ دیا اور اپنی زبان کا جادو چلا کر ان سے پیسے بطور لئے اور انہیں کہا کہ وہ کچھ اور عمل کرے گا۔
 کئی دن گزر گئے، ممتاز کی ماں اور خالہ نہ آئیں۔ ایک روز علی رضا ایک جوان آدمی کو ساتھ لے کر شفاعت کے پاس گیا۔ ابھی شکوری کے پراسرار اغوا کا واقعہ نہیں ہوا تھا۔ علی رضا کے ساتھ جو آدمی تھا، اُس کے نقش بہت اچھے تھے۔ قد کاٹھ بھی اچھا تھا لیکن کسی بیماری نے اُسے ادھڑا کر دیا تھا۔ علی رضا اُسے گھوڑی پر لایا تھا۔ اُس نے اُس گاؤں کا نام لیا جو ممتاز کا گاؤں تھا اور اس آدمی کا وہی نام بتایا جس کے ساتھ ممتاز شادی کرنا چاہتی تھی۔

”یہ میرا جگر سیار ہے۔“ علی رضا نے شفاعت کو بتایا۔ اُسے معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے۔ دس بارہ دنوں سے اس کی یہ حالت ہے کہ سارے جسم پر خارش ہوتی ہے اور کہتا ہے کہ جسم کے اندر جیسے آگ لگی ہوتی ہے، سنیا سیوں اور حکیموں کا علاج کرایا ہے مگر شفاعت دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ رات کو خارش اسے سونے نہیں دیتی۔“

اس آدمی کے چہرے کا رنگ پھیکا نیلا ہو گیا تھا اور چہرے کی ہڈیاں باہر آ گئی تھیں۔ شفاعت استاد آدمی تھا۔ اُس نے ہنسی مذاق کے انداز سے یا ہلکے پھلکے انداز سے تصدیق کر لی کہ یہ وہی جوان ہے جسے ممتاز چاہتی ہے۔ شفاعت آنکھیں بند کر کے مراقبہ کی کیفیت میں چلا گیا۔

”تمہارے سر میں میم کا لفظ سانپ کی طرح بیٹھ گیا ہے۔“ شفاعت نے کہا۔ ”میم سے محبت بنتی ہے۔ دو میم ممتاز کے ہیں اور ایک میم موت کا ہے۔ محبت اور ممتاز کے میم دماغ سے نکال دو گے تو موت کا میم خود ہی نکل جائے گا۔۔۔ ممتاز مردوں کے نام ہوتے ہیں لیکن یہ ممتاز ایک بڑی خوبصورت عورت ہے۔“

اُس آدمی نے حیران ہو کر شفاعت کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔
 ”مہاراج!۔“ اُس نے شفاعت سے کہا۔ ”یہ نام تو میری رُوح میں اُتر گیا ہے۔۔۔ ممتاز۔ ممتاز۔“

”جو چیز تمہیں نہیں مل سکتی اُس کی طرف دیکھنا چھوڑ دو۔“ شفاعت نے محمد سے لہجے میں کہا۔ ”تمہارے دل میں ممتاز ہے تو اسے دل سے نکال دو۔ ستارے مل نہیں رہے۔ تمہارا ستارہ اور اُس کا ستارہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ اکٹھے ہوں گے تو دونوں ٹوٹ جائیں گے۔ دونوں کا خون ہو جائے گا۔ تمہیں کوئی بیماری نہیں۔“

”میرے دل میں ممتاز کی محبت ضرور ہے مہاراج!“ اس آدمی نے مری مری آواز میں کہا۔ ”لیکن میں اُس کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتا۔ ممتاز کہتی ہے کہ تمہارے سوا کسی اور کو قبول نہیں کروں گی لیکن ہماری شادی نہیں ہو سکتی۔ وہ کہتی ہے کہ آؤ جھاگ چلیں۔ میں ایسی بیوقوفی نہیں کروں گا۔“

”مت کرنا ایسی بیوقوفی۔“ شفاعت نے کہا۔ ”اُسے صاف لفظوں میں کہہ دو کہ تم اُس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے۔ تعلق رکھو گے تو مارے جاؤ گے۔ تم مارے جا رہے ہو۔۔۔ ایک بات بتاؤ کسی نے تمہیں کوئی ایسی ویسی چیز تو نہیں کھلائی؟ مثلاً اُس لڑکی کے کسی بھائی نے یا اُس کے گھر کی کسی عورت نے تمہیں مٹھائی یا اس طرح کی کوئی اور چیز کھلائی ہو؟“

”نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”وہ لوگ میرے ساتھ اچھی

طرح بوتے بھی نہیں۔ انہیں شاید پتہ چل گیا ہے کہ ممتاز مجھے چاہتی ہے۔
 وہ میرے قریب آتے ہیں نہ میں ان کے قریب جاتا ہوں؟
 ان کے قریب نہ ہی جاؤ تو اچھا ہے۔ شفاعت نے کہا۔
 ”جیسے آپ کہیں گے کروں گا۔“ اس آدمی نے کہا۔

لڑکی غائب ہو گئی

”جواب دے دو۔“ شفاعت نے کہا۔ ”صاف جواب دے دو۔“
 شفاعت کو ایسی کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ یہ شخص ممتاز کے ساتھ تعلقات
 ختم کرے یا نہیں۔ یہ تو اتفاق کی بات تھی کہ یہ آدمی اپنی بیماری کے علاج
 کے لئے شفاعت کے پاس آ گیا تھا۔ شفاعت ممتاز کی ماں کے آگے اپنے نبہ
 بنارہا تھا جو آگے چل کر اُس نے بنا لئے۔ شفاعت اس شخص کی بیماری بھی
 سمجھ گیا تھا۔ وہ چونکہ جرائم کی دُنیا کا آدمی تھا اور سادھوؤں، سنیا سیوں اور
 کالے علم کا کاروبار کرنے والوں کو بھی جانتا تھا اس لئے اُسے ایک شک ہوا
 ”مک صاحب! میں آپ کو اپنے کاروبار کا ایک راز بتاتا ہوں۔“
 شفاعت نے مجھے یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے شاید کبھی دیکھا
 ہو کہ عامل، شاہ، سادھو اور سنیا سی خصوصاً کالا علم چلانے والے کسی مریض
 کو یا کسی حاجت مند کو کاغذ پر غلے ڈال کر اور ان خانوں میں ہند سے
 اور عروف لکھ کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ پانی میں گھول کر پینے ہیں۔ ایسے
 تعویذ عموماً نگارِ روشنائی سے لکھے جاتے ہیں لیکن یہ روشنائی نہیں ہوتا
 یہ جڑی بوٹیوں کا محلول ہوتا ہے۔ ان میں ایسا اثر ہوتا ہے کہ بیمار ہو کہیں
 دُور ہو، یہ فوراً ٹھیک ہو جاتا ہے لیکن یہ اثر عارضی ہوتا ہے۔ مسائل عامل صلا
 کا مرید بن جاتا ہے۔“

شفاعت نے ایک اور انکشاف کیا جو اُس وقت میرے لئے نیا تھا اس
 نے کہا۔ ”ایک محلول زہر کا ہوتا ہے۔ ایک دو بچھو اور ایک دو مکٹیاں جو اک

کے پودے پر بیٹھی رہتی اور آگ کو ہی اپنی خوراک بناتی ہیں، مار کر انہیں
 رگڑ لیتے ہیں۔ اسے مزید تیز کرنا ہو تو اس میں سانپ کا زہر ملا لیتے ہیں۔
 اس میں رنگدار (عموماً نارنجی رنگ کا) پانی ملا لیتے ہیں۔ بعض لوگ اپنے
 دشمنوں کو نقصان پہنچانے کے لئے عاملوں یا کالا علم جاننے والوں کے پاس
 جاتے ہیں۔ عامل بے شمار پیسے لے کر انہیں اس زہریلے محلول سے تعویذ
 لکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کسی طرح اُس آدمی یا عورت کو پانی میں گھول
 کر بلا دیں، چونکہ کاغذ پر لکیریں، حمد و ف اور ہند سے زہریلے مادے سے لکھے
 ہوتے ہوئے ہیں اس لئے یہ مادہ پانی میں مل کر جب پانی پینے والے کے
 معدے میں جاتا ہے تو وہ شخص مرتا نہیں، اُس پر وہی اثر ہوتا ہے جو اس
 آدمی پر ہوا جس کے ساتھ ممتاز شادی کرنا چاہتی تھی۔ لوگ اسے شاہ صاحب
 کے تعویذ کی کرامات سمجھتے ہیں۔“

شفاعت نے جب اس آدمی کی بیماری کی علامتیں سنیں تو اُسے شک
 ہوا کہ ممتاز کی ماں اتنے دنوں سے نہیں آتی تو ہو سکتا ہے وہ کسی اور سادھو
 یا عامل کے پاس چلی گئی ہو اور اُس عامل یا سادھو یا پنڈت نے اُسے زہریلے
 محلول سے نقش لکھ دیا ہو اور یہ نقش اس شخص کو ملا دیا گیا ہو۔
 شفاعت نے اس شک کی بنا پر اُسے زہر کے اثرات ذائل کرنے
 والی جڑی بوٹیوں کی بناتی ہوئی گولیاں دے دیں اور ایک کاغذ پر کالی سیاہی
 سے ایک تعویذ لکھ کر دے دیا کہ اسے ہر مل کی دھونی دے کر بازو کے ساتھ
 باندھ لینا۔

دس گیارہ دن گزرے تو یہ آدمی پھر شفاعت کے پاس آیا۔ اُس کے
 جہرے کی نیلا ہٹ ختم ہو گئی تھی۔ سینے اور پیٹ کی جلن بہت کم اور غارش
 بالکل ختم ہو گئی تھی۔ کمزوری بھی نہیں رہی تھی۔ اُس نے شفاعت کو ایک نیا
 ٹھیکس اور انعام کے طور پر خاصی رقم دی۔ اس سے شفاعت کو یقین ہو گیا کہ
 اسے واقعی زہر دیا گیا تھا۔

اتفاق دیکھیں کہ اس سے تین چار روز بعد ممتاز کی ماں اور خالہ اگئیں۔

گیا ہے۔ بہاری اُن کے ساتھ کوئی ناراضگی تو نہیں تھی، میں اُسے دیکھنے کے لئے اُس کے گھر گئی۔ اُس کا سینہ جل رہا تھا اور جسم پر خارش کرتا تھا۔ اس کے بعد ہم نے اُسے بہت بُری حالت میں دیکھا میں خوش ہوتی کہ کیکر والے ساتیں کا تعویذ کام کر گیا ہے۔ اس آدمی کے علاج معالجہ بہت کمایا پھر میں نے دیکھا کہ وہ ٹھیک ہونے لگا۔ میں اُس کے گھر گئی اور بظاہر خوشی کا اظہار کیا کہ وہ ٹھیک ہو گیا ہے لیکن دل میں بہت افسوس کیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کس سیانے کی دوائی نے اثر کیا ہے۔ اُس نے جو نشانیاں بتائیں وہ آپ کی تھیں۔ اُس نے بتایا کہ سادھو نے دوائی کے علاوہ ایک تعویذ ساجھی دیا تھا۔ شاید وہ آپ ہی کے پاس آیا تھا۔

”ہاں وہ میرے پاس آیا تھا۔ شفاعت نے کہا۔“ اُس نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کسی لڑکی کو چاہتا ہے۔ میں نے اس آدمی کی آنکھیں کھینچیں تو مجھے شک ہوا۔ میں نے اس شخص کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اپنے علم کا زور چلایا اور آنکھیں بند کیں تو مجھے تنہا ہی بیٹی کا نام نظر آیا۔ میں سمجھ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ایک لڑکی ہے جس کا نام ممتاز ہے، اُس کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے اُس نے وہی تعلق بتا دیا جو تم نے مجھے بتایا تھا۔ ”میں نے اُسے کہا کہ اس لڑکی کو دل سے نکال دو۔ اُسے کہہ دو کہ اُس کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ قسم کھا کر کور سے کاغذ پر انگوٹھا لگا تے پھر وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اُس نے فوراً قسم کھائی کہ وہ آج ہی لڑکی کے ساتھ تعلق توڑ لے گا۔ میں نے اُس سے انگوٹھا لگو لیا اور اُسے ایک نقش دے کر کہا کہ اُس نے قسم پوری کر دی تو ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر لڑکی تو اُس کا حال اس سے بھی بُرا ہو گا۔“

”اُس نے ممتاز کو جواب دے دیا تھا۔“ ممتاز کی ماں نے کہا۔ ”میرے مجھے اُسی عورت نے بتایا تھا جس کے ہاتھ میں نے پانی بھیجا تھا۔ اُس نے اس عورت کی زبانی ممتاز کو پیغام بھیجا تھا کہ ممتاز اُسے دل سے اُتار دے۔ یسُن کر آپ پر ہمارا یقین پڑتا ہو گیا، لیکن لڑکی غائب ہو گئی ہے۔ ہم اس

پریشانی اُن کے چہروں سے ظاہر ہو رہی تھی۔ ماں نے پہلی بات یہ کی کہ ممتاز کہیں چلی گئی ہے۔

”اُسی آدمی کے ساتھ؟“

”نہیں۔“ ماں نے جواب دیا۔ ”وہ آدمی یہیں ہے اور اُس پر شک بھی نہیں۔“

”بات یہ ہے ہمارا جی اُجا۔“ ممتاز کی خالہ نے کہا۔ ”ہم ایک اور آدمی کے پاس چلی گئی تھیں۔ آپ شاید اُسے جانتے ہوں گے۔ وہ کیکر والا ساتیں کے نام سے مشہور ہے۔“

”ایک کیکر کے درخت کے نیچے اُس نے چھوٹا سا خمیر لگا رکھا ہے۔ شفاعت نے کہا۔“ ”تمہارے گاؤں سے تھوڑی ہی دُور ہے۔“

”وہی۔“ ممتاز کی ماں نے کہا۔ ”آپ کی طرح اُس کی بھی بہت شہرت سُنی تھی۔ آپ کی طرف سے ہم مایوس ہو گئی تھیں۔ آپ کے تعویذوں کا لڑکی پر ذرا ساجھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ ہم کیکر والے ساتیں کے پاس چلی گئیں اور اُسے اپنا مسئلہ ویسے ہی بتایا جیسے آپ کو بتایا تھا۔ ہم نے اُسے کہا کہ یہ آدمی جسے ہماری بیٹی چاہتی ہے، نظروں سے اوجھل ہو جاتے تو لڑکی کا داغ اپنے منگیتر کی طرف آجاتے گا۔ ساتیں نے تین سو روپے مانگے۔ ہم نے اُسے اڑھائی سو دیتے۔ اُس نے ایک تعویذ لکھ دیا اور کہا کہ یہ کسی طرح اُس آدمی کو پلا دو۔“

”تعویذ کس رنگ سے لکھا گیا تھا؟“

”پھیکا سا سبز رنگ تھا۔“ ماں نے کہا۔ ”ہمارے گاؤں کی ایک عورت گھر گھر کام کرتی اور خفیہ کام بھی کر دیتی ہے۔ میں نے تعویذ پانی میں گھول کر پانی ایک شیشی میں ڈالا اور اس عورت کو انعام دے کر کہا کہ اُس آدمی کو یہ پانی دے اور کہے کہ ممتاز نے یہ کہہ کر بھیجا ہے کہ اُس نے یہ پانی دم کرایا ہے۔ اسے پی لے پھر ان کی شادی ہو جائے گی“

”اس عورت نے یہ کام کر دیا۔ تیسرے روز پتہ چلا کہ وہ آدمی بیمار ہو

لئے آتی ہیں کہ اپنے علم کے ذریعے معلوم کریں کہ ممتاز کہاں ہے۔
 ”یہ علم بڑا خطرناک ہے۔“ شفاعت نے کہا۔ ”یہ جنوں کے
 ذریعے کرایا جاتا ہے۔ بعض جن شیطان ہوتے ہیں گڑبڑ کرتے ہیں میں
 نے اس آدمی کے دل سے ممتاز نکالی اور انہوں نے لڑکی کو غائب کر
 دیا۔ مجھے اپنی جان کا خطرہ رہتا ہے۔ پھر بھی میں لڑکی کا پتہ چلاؤں گا۔“

”جن کا دل خوش کر دو“

شفاعت نے ان عورتوں پر اپنی زبان کا جادو چلا کر انہیں اپنے
 ساتھ اتنا کھول لیا تھا کہ وہ اُسے ہر بات بتاتی چلی جا رہی تھیں۔ ان
 عورتوں کو یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اُن کے ہاتھوں اُس آدمی کو نہ ہر پلا
 نقش پلا گیا ہے۔ شفاعت نے اُن سے پوچھا کہ وہ اُسی عامل کے پاس
 کیوں نہیں گئیں؟ ہو سکتا ہے وہ ممتاز کا اتنا پتہ بتا دے۔
 ممتاز کی ماں نے اپنی بہن کی طرف دیکھا۔ بہن ذرا مسکراتی۔ یہ
 عورت خاصی خوبصورت تھی۔

”آپ سے کیا پردہ؟“ ممتاز کی ماں نے کہا۔ ”ہم عزت اور
 غیرت والے لوگ ہیں۔ ہماری بیٹی لاپتہ ہوتی تو ہم اُس کے پاس گئیں
 میں نے پہلے بھی دیکھا تھا کہ ہم جب بھی اُس کے پاس جاتیں، وہ میری
 اس بہن پر ہی نظریں جلتے رکھتا اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی تھی۔
 اب گئیں تو اُس نے اسے کہا کہ تم جو بات منہ سے نکالو وہ پوری ہو
 سکتی ہے۔۔۔ میرا ایک جن تم پر فدا ہو گیا ہے۔ اس کا دل خوش کر دو۔
 ابھی ساتھ والے کمرے میں چلی چلو۔ چاہو تو رات کو آجانا۔ میں اُسے حاضر
 کر لوں گا۔ پھر جو چاہو گی پاؤ گی۔ اپنے دشمنوں کی طرف دیکھو گی تو وہ تمہارے
 قدموں میں بیٹھ جائیں گے۔۔۔

”ہم جانتی ہیں کہ جن بھوت موجود ہیں لیکن اس شخص کی آنکھوں میں

مجھے جانے کس طرح نظر آ گیا کہ جو جن میری بہن پر فدا ہو گیا ہے وہ جن یہ شخص
 خود ہے۔ میری بہن تو پہلے ہی دیکھ رہی تھی کہ یہ شخص اسے بھوکے نظروں
 سے دیکھتا رہتا ہے۔ ہم دونوں اٹھ کھڑی ہوئیں اور اُسے کچھ کہے بغیر
 واپس آ گئیں۔“

شفاعت کو اپنی شرافت جتانے کا موقع مل گیا۔ کہنے لگا کہ ہمارے
 پاس جو عورت آتی ہے اُسے میں اپنی ماں بہن سمجھتا ہوں۔ تم دن کو آؤ،
 رات کو آؤ، میری نظر میں فرق نہیں آئے گا۔
 ”کیا تم نے تھانے میں اپنی بیٹی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی ہے؟“
 شفاعت نے پوچھا۔

”نہیں۔“ ممتاز کی ماں نے جواب دیا۔ ”میرے بیٹے نہیں
 ملتے۔ کہتے ہیں جہاں چلی گئی ہے وہیں ذلیل ہوتی رہے۔ واپس آتی تو
 قتل کر دیں گے۔“
 ”تمہارا خاوند کیا کرتا ہے؟“

”اُس کی کون سنتا ہے۔“ ممتاز کی ماں نے کہا۔ ”وہ تو مزارعوں
 اور نوکرؤں پر حکم چلانے کے سوا کچھ نہیں کرتا۔ بیٹے اُس کی مانتے بھی نہیں۔
 میں نے اپنے بیٹوں کی تربیت بھی کی تھی کہ تھانے رپورٹ دے دیں لیکن
 وہ نہیں ملتے۔۔۔ میں ماں ہوں۔ میں کس طرح اپنے دل پر پتھر رکھ سکتی
 ہوں۔ میں معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ میری بیٹی کہاں ہے؟“
 ”پتہ چل جائے گا۔“ شفاعت نے کہا۔ ”کل آنا۔“

مجھے معلوم نہیں کہ شفاعت کہاں تک سچ کہتا تھا۔ اُس نے مجھے یہ
 واقعہ سناتے ہوئے کہا۔ ”ایک طریقہ ہوتا ہے جو اگر ٹھیک طرح کیا جائے
 تو گمشدہ آدمی کا کچھ اشارہ مل جاتا ہے۔ میں نے رات کو وہ عمل کیا تو مجھے
 ایسا اشارہ ملا جیسے لڑکی ماری گئی ہے، یعنی قتل ہو گئی ہے یا کسی اور طرح
 مر گئی ہے۔ میں نے اس اشارے کو صحیح نہ سمجھا۔ میرا خیال تھا کہ میرا عمل
 غلط ہے۔۔۔

”اگلی صبح ممتاز کی ماں اور خالہ اگئیں۔ میں نے انہیں کہا کہ ابھی کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ آج رات پتہ چل جائے گا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ میں پتہ چلا لوں گا۔ اس صورت میں ہمارے پاس ایسے الفاظ ہوتے ہیں جن سے سائل کو دھوکے میں رکھا جاسکتا ہے۔ میں نے انہیں الفاظ کے جادو میں لاکر چلتا کیا اور کہا کہ کل آئیں۔“

شفاعت نے مجھے بتایا کہ کچھ بھی پتہ نہ چلے تو گمشدہ فرد کے لواحقین کو کوئی عمل بتا دیا جاتا ہے کہ یہ کس یا یہ پڑھیں تو انہیں اشارہ ملے گا کہ گمشدہ فرد کہاں ہے۔ ایسا اشارہ کبھی نہیں ملتا اور وہ جھٹکتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ گم ہو جانے والا واپس آجاتا ہے یا کہیں مل جاتا ہے یا اس کی لاش مل جاتی ہے۔

ممتاز کا بڑا بھائی

اس سے اگلے دن ایک آدمی شفاعت کے پاس آیا جس کی عمر ستائیس سال کے قریب ہوگی۔ وہ شکل و صورت، چال ڈھال اور لباس سے امیر و مہمانی لگتا تھا۔ اس نے آتے ہی ”بڑے پنڈت جی“ کا پوچھا۔ شفاعت نے بتایا کہ وہی بڑا پنڈت ہے۔ اس آدمی نے پانچ روپے شفاعت کے ہاتھ میں دیتے۔

”کیا مشکل ہے؟“ شفاعت نے سادھوؤں کے انداز سے

اس سے پوچھا۔

”میرا نام فیروز ہے پنڈت جی؟“ اس آدمی نے کہا اور بتایا کہ وہ ممتاز کے گاؤں سے آیا ہے، پھر کہنے لگا۔ ”میں ممتاز کا بڑا بھائی ہوں۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے ممتاز کون ہے۔ میری ماں اور خالہ آپ کے پاس آتی رہی ہیں۔ اب نہیں آئیں گی۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں ممتاز کہاں ہے؟“

”معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ شفاعت نے کہا۔ ”مت کوشش کریں۔“ فیروز نے کہا۔ ”اگر آپ کو پتہ چل جائے کہ میری بہن کہاں ہے تو میری ماں اور خالہ کو نہ بتائیں۔ کسی اور کو بھی نہ بتائیں۔ آپ جو خدمت بتائیں گے کروں گا۔۔۔ نقد۔۔۔ اور جو مانگیں گے دوں گا۔“

”کیوں؟“ شفاعت نے راز داری سے پوچھا۔ ”تم اس بات کو چھپانا کیوں چاہتے ہو؟“

”اس میں راز والی کوئی بات نہیں۔“ فیروز نے کہا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ میری بہن واپس آئے۔ ایسی بہن جسے خاندان کی عزت کی، اپنے باپ اور اپنے بھائیوں کی عزت کی پرواہ نہ ہو، اسے وہیں رہنا چاہیے جہاں وہ چلی گئی ہے۔ اگر وہ واپس آگئی تو ہم دو بھائی اس کے جسم کا قیدی بنا کر محتالے چلے جائیں گے۔ ہماری ماں پاگل ہو جائے گی۔ اگر میری ماں کو پتہ چل گیا کہ ممتاز کہاں ہے تو وہ دوڑ کر پہنچے گی۔ وہ ماں ہے۔ اگر ماں اسے گھر لاتے گی اور اسے ہم سے بچانے کی کوشش کرے گی تو ماں بھی ہمارے ہاتھوں ماری جاتی ہے۔۔۔ بڑے پنڈت جی! کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہماری بہن کا پتہ ہی نہ چلے کہ وہ کہاں ہے، ورنہ خون خرابہ ہو جائے گا۔“

شفاعت کا یاں آدمی تھا۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ اس سطح کے لوگ جو جرائم کو اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں وہ اوسط درجہ انسان سے

زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔ اب جرم و سزا کی صورت حال بالکل ہی بدل گئی ہے۔ جرم کر کے سزا سے بچنا مشکل نہیں رہا۔ انگریزوں کے دور میں قانون سے بچنا اگر ناممکن نہیں تو ایسا آسان بھی نہیں ہوتا تھا جیسے آج ہوتا ہے۔ میں شفاعت کی سطح کے مجرموں کی بات کر رہا ہوں۔ وہ بڑا کامیاب ایکڑ تھا اور فوراً بات کی تہہ تک پہنچ جاتا تھا۔ اس نے فیروز سے زیادہ سے زیادہ رقم بٹورنے کی ٹھان لی۔

”ممتاز مجھے مری ہوئی نظر آرہی ہے۔“ اُس نے کہا۔

”کہاں؟“

”تم نے کہا ہے کسی کو نہ بتانا۔“ شفاعت نے کہا۔ ”میں زبان پر نہیں لاؤں گا۔“

”ہاں۔“ فیروز نے کہا۔ ”زبان پر موت لائیں۔“

”لیکن مجھ پر تمہارا حکم نہیں چلے گا۔“ شفاعت نے کہا۔ ”ہو سکتا

ہے کسی جگہ مجھے زبان پر لانا پڑے۔“

فیروز نے جیب سے دس دس روپوں کے کچھ نوٹ نکالے اور پانچ نوٹ شفاعت کے آگے پھینک دیتے۔ یہ رقم آج کے سات آٹھ سو روپوں کے برابر تھی۔

”زبان بند رکھنا۔“ فیروز نے شفاعت کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر کہا۔ ”دیکھو سا دھوم ہمارا راج! میں تمہاری خدمت کمر باندھوں۔“

میری بات نہیں مانو گے تو صاف سن لو۔ تم پیر اور پیغمبر نہیں ہو تمہارا

یہ علم تمہیں موت سے نہیں بچا سکے گا۔ تمہارے چیلوں چانٹوں کو تمہاری

لاش ملے گی، یہ پتہ نہیں چلے گا کہ ان کے گور و مہاراج کو کون مار گیا ہے۔

دوستوں کی طرح بات کرو۔“

شفاعت طنز پر سی ہنسی ہنس پڑا اور بولا۔ ”دوست اس طرح

بات نہیں کیا کرتے جس طرح تم کر رہے ہو۔ راز پورا دو، جیب سے کچھ

اور نکالو، پھر اگر تم پر ایسا وقت آن پڑا تو دیکھنا یہ گور و تمہیں کس طرح بچاتا

ہے۔“ اُس نے فیروز کے قریب ہو کر دھیمی آواز میں پوچھا۔ ”بہن

کو پار کر دیا ہے؟“

”نہیں، بہنیں۔“ فیروز نے پُر زور طریقے سے کہا۔ ”میں اُسے

پار کر چکا ہوں تو تمہارے پاس کیوں آتا۔“

”مجھے تو اُس کی لاش نظر آرہی ہے۔“ شفاعت نے کہا۔

”ہو سکتا ہے اُسے کسی اور نے مار ڈالا ہو۔“ فیروز نے کہا۔ ”اگر

ایسا ہوا ہے تو میں خوش ہوں۔“

”اُس آدمی سے منہیں پوچھا جسے وہ چاہتی تھی؟“

”وہ بے قصور ہے۔“ فیروز نے جواب دیا۔ ”اُس نے ممتاز کو

جواب دے دیا تھا۔۔۔ یہ سب خالص باتیں ہیں پنڈت جی! میں جس کام کے

لئے آیا ہوں وہ کرو۔ یہ رقم تھوڑی نہیں۔ کہو گے تو اور بھی دوں گا۔ یہ بھی یاد

رکھنا کہ میری مال اور خالہ کو پتہ نہ چلے کہ میں یہاں آیا تھا۔“

”اتنے ہی نوٹ اور دسے دو۔“ شفاعت نے کہا۔

فیروز نے بڑے غصے سے پچاس روپے اور شفاعت کے آگے پھینک دیئے اور چلا گیا۔

پھولدار ریشمی کپڑا اور جھمکے

برائے بولتے شفاعت اس طرح چونک پڑا جیسے کسی نے اُسے

سوچی چبھوتی ہو یا جیسے اُسے کسی کیڑے مکوڑے نے کاٹ لیا ہو۔ وہ آنکھیں

پھاڑے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اُس کے چہرے پر خوف کا بڑا صاف

تاثیر آ گیا۔

”آپ نے کچھ دیکھا تھا ملک صاحب؟“ اُس نے قدرے کانپتی ہوئی

آواز میں پوچھا۔

”نہ یاد۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے تو یہی دیکھا ہے کہ تم اچانک ڈر

گئے ہو۔۔۔ کیا نظر آیا ہے؟“

”کسی چیز نے میرے دل کو بڑی زور سے کچل لیا تھا۔“ اُس نے کہا

۔ ”میں نے شاید سفید کپڑوں میں کسی کو دیکھا ہے۔ وہ اُڑ گیا ہے۔“

”تمہارا وہم ہے شفتا؟“ میں نے کہا۔ ”چرس کاش لگا لو۔“

اُس نے ٹوپی میں تمباکو کے ساتھ چرس تو بھری لیکن وہ نارمل نہیں

رہا تھا۔ اُس نے ٹوپی کا سارا تمباکو پی لیا۔ اس سے سنبھل گیا۔

”میں بڑی خطرناک لائن پر چڑھ گیا ہوں“ اُس نے کہا۔ ”لوگ کہا کرتے ہیں کہ جس کے قبضے میں جتن ہوتے ہیں وہ جنتوں کے ہاتھوں مرنا ہے۔ یہ غلط ہے۔ یہ سب اس علم کا پکڑ ہے جسے لوگ کالا علم کہتے ہیں۔ یہ اٹاپڑ جاتے تو بڑی موت مارتا ہے۔۔۔ مجھے ایک جھٹکا سا پڑا ہے۔“

میں اُس کی یہ کہانی اس لئے نہیں سن رہا تھا کہ یہ بڑی دلچسپ اور سنسنی خیز کہانی تھی، میں تو اُس لاش کے متعلق سراغ تلاش کر رہا تھا جو ناقابل شناخت حالت میں ملی تھی۔ کبھی ایسے پتہ چلتا تھا جیسے شفاعت سے مجھے سراغ مل رہا ہے، کبھی ایسے جیسے میرا وقت تباہ ہو رہا ہے۔

”اگر تھک گئے ہو تو تھوڑی دیر کے لئے سو جاؤ۔“ میں نے اُسے کہا۔

”میں ملک صاحب!“ اُس نے کہا۔ ”میری بات پوری سن لو۔ میں یقین سے نہیں کہہ رہا کہ وہ لاش ممتاز کی تھی۔ میں آپ کو ساری بات سنا دیتا ہوں۔ سراغ لگانا آپ کا کام ہے۔“

اس کے بعد وہ بولتا تو رہا لیکن صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اُکھڑ گیا ہے۔ اُس کے بولنے میں پہلے والی جان نہیں رہی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ وہ مجھے سنار ہاتھاکر انہی دنوں علی رقم نے اُس کے ساتھ شکوری کے متعلق بات کی کہ یہ لڑکی رات کو باہر آجاتے تو علی رقم اُسے خراب کر کے چھوڑ دے گا۔

یہ سارا واقعہ تو آپ پھلے پڑھ چکے ہیں کہ شفاعت نے کس طرح شکوری کو گھر سے نکالا تھا۔

شکوری کے لاپتہ ہونے کے تیسرے چوتھے روز شفاعت کو اُس کے چیلوں لے بتایا کہ دو سو ادمیل دور ایک ویران جگہ سے ایک عورت کی لاش ملی ہے۔ چیلوں نے اُسے یہ بھی بتایا تھا کہ لاش کھاتی ہوئی ہے اور بچانی نہیں جا سکتی شفاعت نے یہ سنا تھا کہ اس لاش کو شکوری کی لاش لکھ دیا گیا تھا لیکن اُس نے اس طرف زیادہ دھیان نہ دیا۔

”کیا تمہیں ممتاز یاد نہیں آتی تھی؟“ میں نے شفاعت سے پوچھا

”تمہیں ایسا خیال نہیں آیا تھا کہ یہ لاش ممتاز کی ہو سکتی ہے؟“

”نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”مجھے کوئی خیال نہیں آیا تھا۔ تین چار دنوں بعد میں وہاں سے گزرا تو ایک جگہ زمین پر کچھ نشان سے نظر آئے۔ مجھے اچانک یاد آگیا کہ میرے بالکون لے مجھے بتایا تھا کہ اس علاقے سے لاش برآمد ہوتی تھی اور وہ شاید یہی جگہ ہوگی۔ وہاں مٹی میں کپڑے کا ایک ٹکڑا دبا ہوا دیکھا۔ میں نے مٹی میں سے نکال لیا۔ اس پر کچھ جامہوا تھا جو میں نے جھاڑا۔ یہ ٹکڑا نصف گز لمبا ہوگا۔ یہ لمبوتر تھا جھاڑ کر دیکھا۔ یہ ریشمی پھولدار کپڑا تھا۔۔۔“

”جہاں سے میں نے کپڑا مٹی کے نیچے سے نکالا تھا، وہاں پھر ویسے ہی نظر آتی تو چمکتی ہوئی کوئی چیز دکھائی دی۔ یہ مٹی میں دبئی ہوئی تھی اور ذرا سی باہر تھی۔ میں نے اسے مٹی سے نکالا۔ یہ سونے کی ٹرکی تھی۔ میں کپڑا اور ٹرکی اٹھاتے ہوئے آگے چلا گیا۔ مجھے ادھر ہی جانا تھا۔ برساتی نالے میں ایک جگہ ٹھوڑا سا پانی جمع تھا۔ کپڑا اس میں ڈبو کر نچوڑا تو اس سے مٹی بالکل صاف ہو گئی۔ میں نے اسے دھونے کی ضرورت اس لئے محسوس کی تھی کہ اس کپڑے پر مجھے کچھ شک ہوا تھا۔ کپڑا دھل کر سامنے آیا تو مجھے ممتاز یاد آگئی۔“

آپ کو یاد ہوگا کہ ممتاز کی ماں اور خالہ پہلے روز شفاعت کے پاس گئیں اور اُسے کہا تھا کہ ممتاز اپنے منیگٹر کی بجائے کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ شفاعت نے انہیں کہا تھا کہ لڑکی کے جسم سے اُتری ہوئی قیض اسے دے جائیں۔ اگلے روز انہوں نے اپنے نوکر کے ہاتھ ممتاز کی قیض بھیجی تھی جو ریشمی کپڑے کی تھی۔ یہ ٹکڑا جو شفاعت کو ملا تھا، یہ بھی ریشمی کپڑے کا تھا، رنگ ممتاز کی قیض والا اور پھول بھی وہی تھے۔

اُس زمانے میں دیہات کی عورتیں کاشن کے کپڑے پہنتی تھیں۔ پھول دار کپڑوں میں چھینٹ زیادہ استعمال ہوتی تھی۔ ریشمی کپڑے امیر ماں باپ کی بیٹیاں پہنتی تھیں۔ ممتاز امیر زمیندار کی بیٹی تھی۔ ممتاز کی قیض شفاعت کے پاس آتی تھی تو وہ اسے بہت دیر دیکھتا رہا تھا۔ یہ

کپڑا اسے بہت اچھا لگا تھا۔

اس کپڑے کا ایک ٹکڑا اٹھانے میں بھی آیا تھا جو محفوظ پڑا تھا۔ یہ ایک ہیڈ کانسٹیبل لایا تھا۔ اسی سے پتہ چلا تھا کہ یہ لاش شکوری کی نہیں تھی۔ میں نے یہ ٹکڑا نکال کر شفاعت کو دکھایا۔ اسے غور سے دیکھے بغیر اُس نے کہا کہ یہ وہی کپڑا ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ ٹکڑا جو اُسے ملا تھا، وہ اُس کے پاس ہے؟

”محفوظ ہے یا نہیں، میں کچھ کہہ نہیں سکتا“۔ شفاعت نے بتایا۔ ”میری گف میں پڑا ہوگا۔ میرے پاس ٹرکی محفوظ پڑی ہے۔ اس وقت گف میں ہے۔ وہ صبح سویرے آپ کے پاس بھیج دوں گا۔“ میں نے شفاعت سے کچھ اور باتیں پوچھیں اور اُسے جانے کی اجازت دے دی۔ ایک کانسٹیبل کو اُس کے ساتھ اس لئے بھیجا کہ وہ شفاعت سے کپڑے کا ٹکڑا اور ٹرکی لے آئے۔ شفاعت سے میں نے یہ بھی کہا کہ اُس نے شکوری کے کانوں سے جو بھجکے اُتارے تھے، وہ بھی بھیج دے۔

عمل اُلٹا ہو گیا

شفاعت اور کانسٹیبل کے جانے کے بعد میں سوچوں میں گم ہو گیا۔ اس ناقابل شناخت لاش کا معممہ حل کرنا تھا۔ اگر یہ لاش ممتاز کی تھی تو یہ واردات قتل کی بھی ہو سکتی تھی خودکشی کی بھی میں نے شفاعت کی اتنی لمبی رویت اور ایک سراسر غصاں کی حیثیت سے سنی تھی۔ مجھے کچھ اشارے ملے تھے۔ اگر ممتاز نے خودکشی کی تھی تو اُس کی لاش اُس کے گاؤں سے چار میل دُور کس طرح پہنچی؟ خودکشی کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ وہ جسے چاہتی تھی اُس نے اُسے جواب دے دیا تھا۔ یہ خیال بھی آیا کہ ضروری نہیں کہ شفاعت نے مجھے ہر بات صحیح بتائی

ہو یا اُسے ممتاز کی ماں اور خالہ نے ہر ایک بات بتائی ہو۔ میرا خیال تھا کہ ممتاز کا تعلق کسی اور کے ساتھ بھی تھا۔ ایک سے اُسے جواب ملا تو وہ دوسرے کے ساتھ گھر سے نکل گئی اور راستے میں قتل ہو گئی۔ تامل وہی ہو سکتا تھا جس کے ساتھ وہ گھر سے گئی تھی۔ اُس نے ممتاز کو راستے میں بے آبرو کیا اور قتل کر کے لاش دبا دی۔ قتل کا شک اُس کے پہلے چاہنے والے پر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ تو اُس کے ساتھ تعلق توڑ چکا تھا۔

اگر ایسا نہیں ہوا تو بھائیوں کو فوراً پتہ چل گیا کہ بہن گھر سے نکل گئی ہے۔ انہوں نے لتا قب کیا اور بہن کو ایک آدمی کے ساتھ جانا پکڑ لیا۔ وہ آدمی بھاگ گیا اور بھائیوں نے بہن کو قتل کر کے لاش وہیں دبا دی۔ ممتاز کے ساتھی کا قتل ہونا لازمی تھا۔ وہ اس لئے بچ گیا ہو گا کہ وہ بھاگ گیا اور دوسری وجہ یہ کہ بھائیوں کو معلوم نہ ہو سکا ہو گا کہ وہ آدمی کون تھا۔ شفاعت کے بیان کے مطابق یہ وہ آدمی نہیں تھا جس کا ذکر ممتاز کی ماں اور خالہ نے کیا تھا۔

بھائیوں پر مجھے اس وجہ سے بھی شک ہو رہا تھا کہ بڑے بھائی نے شفاعت سے کہا تھا کہ وہ اپنے علم کے زور سے اگر معلوم کر لے کہ ممتاز کہاں ہے تو کسی کو نہ بتاتے۔ اُس نے وجہ یہ بتائی تھی کہ اُس کی بہن واپس آگئی تو اُس کے ہاتھوں ماری جاتے گی۔ میرا خیال تھا کہ وجہ یہ نہیں تھی۔ اس بھائی نے اکیلے یاد و نون بھائیوں نے ممتاز کو قتل کر دیا تھا۔ شفاعت نے جب اُسے کہا کہ اُسے اُس کی بہن کی لاش نظر آ رہی ہے تو بھائی نے شفاعت کو نہ مانگے پیسے دیتے تھے۔

مجھے اپنے ایک ہندو کانسٹیبل کی بات یاد آئی۔ سب سے پہلے اُس نے مجھے بتایا تھا کہ لاش قابل شناخت نہیں تھی اور سب انسپکٹر مل داس اور اسے۔ ایس۔ آئی نارائن نے شکوری کے ماں باپ کو ڈرا دھمکا کر اُن سے تصدیق کرائی تھی کہ یہ لاش اُن کی بیٹی کی ہے۔ اس ہیڈ کانسٹیبل نے کہا تھا کہ بھل داس اور نارائن مل کر گڑبڑ کیا کرتے تھے۔ اُس نے یہ بھی کہا

تھا کہ ہل داس نے لاش کی غلط شناخت کرا کے کچھ کہا ہے۔
یہ بات یاد آتی تو میں نے اس شک پر بھی غور کیا کہ ممتاز کو قتل
کرنے والے نے ہل داس کی منٹھی گرم کی ہوگی اور ہل داس نے لاش کی
غلط شناخت کرا کے قاتل کو بچا لیا ہوگا۔

رات کو میں گھر چلا گیا تھا۔ جس کانٹیل کو میں نے شفاعت کے ساتھ
بھیجا تھا، وہ میرے گھر آگیا۔ وہ مڑکی اور شکوری کے جھمکے شفاعت سے لے
آیا تھا۔ کپڑے کا وہ ٹکڑا اُسے نہیں مل سکا جو اُسے لاش کی برآمدگی کی
جگہ سے ملا تھا۔ اُسے سنبھال کر رکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ شفاعت سا دھو
تھا، پولیس کا انسر تو نہیں تھا۔

میں نے مڑکی دیکھی۔ یہ وزنی تھی اور اس میں دو ٹنگ بھی جڑے ہوئے
تھے۔ دیہاتی عورتیں مڑکیاں پہنا کرتی تھیں لیکن یہ وزنی مڑکی کسی عام عورت
کی نہیں لگتی تھی۔ یہ مڑکی یقیناً لاش کے کان سے اُتری تھی۔ درندوں نے
چہرہ بھی کھا لیا تھا۔ یہ مڑکی کان سے الگ ہو گئی۔ دوسری کسی گیدڑ جھیرتیے
یا گتے کے پیٹ میں لاش کے دوسرے کان کے ساتھ ہی چلی گئی ہوگی۔
مڑکی کے متعلق مجھے صبح تفتیش کرنی تھی۔ کانٹیل میرے پاس
بیٹھ گیا۔

”ملک صاحب!“ اُس نے کہا۔ ”اس سا دھونے راستے میں
مجھے ڈرا اُٹھا.... جب وہ اپنی گُف سے تھوڑی دُور رہ گیا تو اس طرح ڈر کر
مڑک گیا جیسے کوئی جانور بدک کر مڑک جاتا ہے۔ میں ڈر گیا۔ سا دھو میرے قریب
ہو گیا اور ہر طرف دیکھنے لگا.... میں نے اُس سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟ اُس
نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے کچھ دیکھا ہے؟ میں نے کہا کہ میں نے تو کچھ نہیں دیکھا۔
وہ کہنے لگا کہ پھر آگئے ہیں۔ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے پوچھا یہ
کون ہیں؟ اُسے کون نظر آیا ہے؟ اُس نے کہا کہ متوکل (جنات) ہیں۔ میں
لے ان سے ایک کام کر آیا تھا۔ وہ تو اُنہوں نے کر دیا ہے لیکن میرے
پچھے پڑ گئے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں انہیں راضی کس طرح کروں....

”مجھے تو کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اُس کی حالت بتا رہی تھی کہ اُسے
کوئی بڑی ڈرافٹنی چیز نظر آ رہی ہے۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر اُس چیز کو جو صرف
اُسے نظر آ رہی تھی، کہا۔ ”نانگو مجھ سے کیا مانگتے ہو، مجھے بخش دو۔ میں
نے بُرا کیا تھا۔ بتیں اپنے پیر پیغمبر کی قسم، مجھے بخش دو۔ پھر کبھی ایسا کام نہیں
کر دوں گا۔“ اس کے بعد وہ جیسے جیسے سانس لینے لگا۔ مجھے ایسے پتہ چل
رہا تھا جیسے اُسے جو کچھ نظر آ رہا تھا وہ چلا گیا ہے....

”ملک صاحب! میرا دل ابھی تک دھک دھک کر رہا ہے۔ اُس کی
لُف میں داخل ہوتے تو اُس کے چیلے دیسی شراب پی رہے تھے بہم دونوں
لو دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سا دھو نے انہیں کہا کہ معاملہ ختم ہو گیا ہے۔
س نے مجھے مڑکی اور جھمکے نکال دیتے لیکن بہت تلاش کے باوجود کپڑے
اُٹھانہ ملا۔ مجھے والپس اکیلے آنا تھا لیکن میں اُٹا ڈر گیا تھا کہ گُف سے باہر
مرد رکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ سا دھو نے مجھے کہا کہ تمہیں ڈرنے کی ضرورت
نہیں، وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے نہ تمہیں نظر آئیں گے.... میں نے دل مضبوط
بادور لگایا۔“

شفاعت کو ایسا ہی دُورہ میرے پاس بھی پڑا تھا۔ میں نے سُن
عانتا تھا کہ کالا علم چلانے والوں کی اپنی جان خطرے میں رہتی ہے اور اس
اُٹا اثر ہو جاتا ہے۔ کسی کو پریشان کرنے کے لئے کالا جادو کیا جاتے تو
اُٹا بھی ہو سکتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ شفاعت اپنے ہی پُراسرارہ عمل کا
فارہ ہو رہا تھا۔ اُس نے شکوری جیسی نیک لڑکی کو کالے جادو کے ذریعے
رستے نکالا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ اُسی کا اُٹا اثر تھا۔ مجھے یاد آیا کہ اُس
میرے ساتھ بائیں کرتے کہا تھا۔ ”میرے آگے کوئی ساری دُنیا
دولت رکھ دے، میں یہ کام پھر کبھی نہیں کروں گا۔ لڑکی میرے سامنے
نی تھی اور مجھے اس طرح پتہ چل رہا تھا کہ باہر جن بمبوت ناچ رہے ہیں۔
جان گیا کہ عمل اُٹا ہو رہا ہے اور اب میری خیر نہیں۔“
مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس کی خیر تھی یا نہیں،

میرا سکہ کچھ اور تھا۔ شفاعت کی خیر خیریت کے ساتھ مجھے ذرا سی بھی دلچسپی نہیں تھی۔
میں نے کانسیٹیل کو بھیج دیا اور غور سو گیا۔

لڑکی نے کہا۔ ”کچھ کھا کر مر جاؤں گی“

میں نے دوسرے دن شکوری کے باپ کو گاؤں سے بلوایا۔ میں نے کانسیٹیل سے کہہ دیا تھا کہ شکوری کے باپ کو بتا دینا کہ شکوری کی انگوٹھی اور بھگے لے جاتے۔

مجھے ممتاز کے دونوں بھائیوں اور ماں باپ کو تھانے بلانا تھا۔ وہ سب مشتعل تھے۔ وہ دوسرے تھانے کے علاقے کے رہنے والے تھے۔ میں نے دفتری کارروائی کرنے سے پہلے اُس تھانے کے سب انسپکٹر انچارج کو ٹیلیفون پر بتا دیا کہ مجھے اُس کے علاقے کے فلاں فلاں افراد کی ضرورت ہے سب سے پہلے شکوری کا باپ آیا۔ اُس کے ساتھ نائیک زبیر احمد بھی تھا۔ اُسے پتہ چلا کہ شکوری کے باپ کو تھانے بلایا گیا ہے تو وہ بھی ساتھ چل پڑا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ اُس کی چھٹی کے دس دن رہ گئے ہیں۔ وہ ڈیڑھ ماہ کی چھٹی آیا تھا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اُس نے اپنے ماں باپ کو رامنی کر لیا ہے اور وہ شکوری کے ساتھ شادی کر رہا ہے۔ شکوری کے باپ نے شکوری کے بھگے پہچان لئے۔ انگوٹھی زبیر کی خریدی ہوئی تھی۔ یہ ملگنی کی انگوٹھی تھی۔ میں نے دونوں چیزیں شکوری کے باپ کو دے دیں۔ وہ رو پڑا۔

”اگر زبیر ہماری مدد نہ کرتا تو ہم جیتے جی غم ہو گتے تھے“ شکوری

کے باپ نے کہا۔ ”زبیر نے بڑی دلیری سے لوگوں کو بتایا ہے کہ شکوری کہاں گئی اور کس طرح گئی تھی“

وہ دونوں جانے لگے تو زبیر میرے پاس کھڑا رہا۔ میں نے اُسے

پہلے بھی کہا تھا اور ایک بار پھر کہا کہ وہ اپنے آپ کو ٹھنڈا رکھے اور انتقام لی نہ سوچے۔

”میں اپنے آپ کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں“ اُس نے کہا۔ ”لیکن میں بتا نہیں سکتا کہ ساڈھو کو دیکھ کر میں ٹھنڈا رہ سکوں یا نہیں“

یہ ذہن میں رکھیں کہ میں نے زبیر کو یہ نہیں بتایا تھا کہ ساڈھو دراصل یہ جراثیم پیشہ ہے۔

دوپہر سے کچھ دیر بعد ممتاز کے والدین اور دونوں بھائی آ گئے۔ وہ موٹروں پر آتے تھے۔ میں نے سب سے پہلے ممتاز کے بڑے بھائی کو اپنے دفتر میں بلا کر بٹھایا۔

”تمہاری بہن جس کا نام ممتاز ہے، کہاں ہے؟“
”یہ پتہ ہوتا تو ہم اُسے وہاں سے لے آتے“ اُس نے جواب دیا۔
”وہ کسی کے ساتھ چلی گئی ہے“
”تھانے میں رپورٹ درج کراتی ہوگی!“
”نہیں“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیا تمہارے والد صاحب اور والدہ ماجد نے کہا تھا کہ تھانے مت جاؤ؟“ میں نے ساتھ ہی کہہ دیا۔ ”میری بات غور سے سن لو فیروز بھائی! میری بات صرف تمہارے ساتھ نہیں ہوئی۔ میں ایک ایک سوال دس دس بارہ بارہ آدمیوں سے پوچھوں گا۔ تم ناجھوٹ بول سکتے ہو بولو، میرے سامنے جھوٹ اور سچ الگ الگ ہو تیں گے۔ اچھی طرح سوچ لو۔ تمہارے منہ سے نکلا ہو ا جھوٹ نہیں پھانسی ہے تنہے پر کھڑا کر سکتا ہے“

”مجھے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں جناب!“ فیروز نے
”میں آپ کو صاف بتا دیتا ہوں کہ میں ایسی بہن کو تلاش کر کے گھر انہیں چاہتا۔ اگر مجھے پتہ چل گیا کہ وہ فلاں جگہ ہے تو میں وہاں چاکر لے

ہوئی تو ہم بتا دیں گے۔ پچھلے ہم سے یہ تو پوچھیں کہ یہ لاش کس کی ہے؟
کیا یہ ہماری بہن کی ہے؟

”لاش کا چہرہ نہیں“۔ میں نے کہا۔ ”وہ شناخت نہیں ہو سکتی“
”پھر لکھ لیں کہ میری بہن لاپتہ ہو گئی ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”یہ

بھی لکھیں کہ وہ اپنی مرضی سے گئی ہوگی۔ ہم اُسے واپس نہیں لانا چاہتے۔“
”ایسا ہی کر دوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے یہ بتاؤ کہ اُس آدمی پر
تمہیں شک نہیں جس کی خاطر تمہاری بہن اپنے ماں باپ کی کی ہوئی منگنی
قبول نہیں کر رہی تھی؟“

اُس نے چونک کر میرے مُنہ کی طرف دیکھا۔ حیرت سے جیسے اُس
کی زبان بند ہو گئی تھی۔

”آپ کو کس نے بتایا ہے؟“ اُس نے حیرت سے دہی ہوئی آواز
میں پوچھا۔

”میرے مُنہ سے تم ایسی باتیں سنو گے جو تم سمجھتے ہو کہ تمہارے
سوا کسی کو معلوم نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اسی لئے میں نے تمہیں سب
سے پہلے کہہ دیا تھا کہ جھوٹ نہ بولنا.... اب بتاؤ تم نے اُس آدمی پر۔“

”سب سے پہلا شک تو اُسی پر ہونا چاہیے تھا۔“ اُس نے کہا
”لیکن اُس میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ ہماری بہن کو اس طرح لے

جائے۔ وہ آدمی گاؤں میں موجود ہے اور اُس سے میں پوچھ چکا ہوں۔ اُس
کا میری بہن کے ساتھ غلط تعلق نہیں تھا۔ میری بہن اُسے پسند کرتی
تھی۔ وہ بُرے چال چلن کا آدمی نہیں۔ اُس نے مجھے ایک عورت کا نام
بتا کر کہا کہ اُس سے پوچھ لو کہ میں نے تمہاری بہن کو کیا پیغام بھیجا تھا۔۔۔
”میں نے اُس عورت سے پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ اس شخص نے میری بہن

کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ میں محبت کی خاطر تمہارے ماں باپ اور بھائیوں کی
عزت خاک میں نہیں ملاؤں گا۔ تم اُس منگنی کو قبول کر لو جو ماں باپ نے
تمہاری کر دی ہے۔ میرا تمہارا تعلق ختم ہے۔“

اور جس کے ساتھ وہ گئی ہے، اُسے بھی قتل کر دوں گا۔ میری ماں اور میرے
باپ نے کہا تھا کہ تمہانے رپورٹ دے دیتے ہیں لیکن میں نے اور میرے
چھوٹے بھائی نے ماں اور باپ کی نہیں مانی۔ میں نے ماں سے کہا کہ ہم
دونوں بھائیوں کو بچانسی چڑھانا یا کالے پانی بھجوانا چاہتی ہو تو پولیس
کے پاس جاؤ اور اپنی بیٹی کو ڈھونڈ لاؤ۔“

”تم نے یہ تو معلوم کیا ہو گا کہ تمہاری بہن گئی کس کے ساتھ ہے؟“
”نہیں۔“ فیروز نے جواب دیا۔

”پھر تم غیرت مند تو نہ ہو تے۔“ میں نے کہا۔ ”تم اتنے شیر بہادر
ہو تے تو اُس آدمی کا سراغ لگا کر اُسے دن دیر ہاڑے قتل کرتے اور
تھانے میں آجاتے۔“

”پتہ نہیں چل رہا وہ کون ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”معلوم کرنے کی
کوشش کر رہا ہوں۔“

”تمہارے گاؤں کا ہی کوئی آدمی ہو گا۔“ میں نے کہا۔ ”کیا
تمہارے گاؤں کا کوئی آدمی غیر حاضر نہیں؟“

”نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔

”کسی پر شک نہیں؟“

”کچھ پتہ نہیں چلتا۔“ اُس نے کہا۔ ”میں نے تو اس بہن کو
دل سے اتار دیا ہے.... آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ ہماری طرف سے
کوئی عرض رپورٹ نہیں۔“

”عرض رپورٹ تو میری طرف سے بھی کوئی نہیں۔“ میں نے کہا
”لیکن قانون ایسا ہے جو مجھے مجبور کر رہا ہے اور اوپر سے حکم
بھی ایسا آیا ہے جسے میں ٹال نہیں سکتا۔“

میں نے اُسے نہ بتایا کہ ایک لاش ملی ہے اور یہ اُس کے متعلق
تفتیش ہو رہی ہے۔

”وہ لاش ہمیں دکھا دیں۔“ اُس نے کہا۔ ”ہماری بہن کی

”تم نے اس عورت سے پوچھا نہیں کہ تمہاری بہن نے کیا جواب دیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”پوچھا تھا“ اُس نے جواب دیا۔ ”میری بہن نے جواب دیا تھا کہ تم نے مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے تو بھی میں اپنی منگنی قبول نہیں کروں گی۔ کچھ کھا کر مر جاؤں گی۔“

”تم نے اپنی بہن سے باز پرس نہیں کی؟“

”میں نے اپنی ماں سے کہا تھا کہ اپنی بیٹی کو سیدھے راستے پر لاؤ ورنہ یہ زہرہ نہیں رہے گی۔“

”وہ لاپتہ کس طرح ہوتی تھی؟“

”ایک صبح ہم جگے تو وہ نہیں تھی۔“ فیروز نے جواب دیا۔

”میری ماں روئے گئی۔ باپ نے کہا کہ تھانے چلو۔ میں نے اور میرے بھائی نے کہا کہ اُسے وہیں رہنے دو جہاں وہ چلی گئی ہے۔ اچھا ہوا وہ بدکار چلی گئی ہے۔“

”تم نے اُس عورت سے نہیں پوچھا تھا جو اُس آدمی کا پیغام تمہاری بہن کے پاس لاتی تھی؟“ میں نے پوچھا اور کہا۔ ”ایسی عورت میں ہر کسی کے خفیہ پیغام ادھر ادھر پہنچاتی ہیں۔“

”اُس سے تو میں نے بڑی اچھی طرح پوچھا تھا۔“ اُس نے جواب دیا۔

”ابھی تک ہڈیوں کی ٹکڑی نہ ہوئی۔ وہ بد معاش عورت ہے۔“

میں نے اُس سے ادھر ادھر کی باتیں پوچھیں لیکن لاش کا ذکر نہ کیا۔ اُسے کوئی شک بھی نہ ہونے دیا۔ میرا اندازہ دوستانہ رہا۔ وہ دلیر آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس سطح کے زمیندار روپے پیسے، اثر و رسوخ اور زمین جاتیاد کی وجہ سے دلیر ہوا کرتے تھے۔ میں نے اُسے باہر بیٹھے کو کہا اور اُس کے چھوٹے بھائی کو بلایا۔

شک پختہ نہیں تھا

اس بھائی کی عمر سترہ اٹھارہ سال تھی۔ اچھا خوبصورت جوان تھا۔ اُس نے اپنا نام اقبال بتایا۔ بڑے بھائی کی طرح اُس کے چہرے پر بھی پولیس کا ڈر نہیں تھا۔

”کہو اقبال؟“ میں نے پوچھا۔ ”تمہاری بہن کہاں گئی؟“

”گئی جہنم میں۔“ اُس نے کہا اور یوں ادھر ادھر دیکھنے لگا جیسے اُسے میری کوئی پرواہ نہیں۔

”میں ڈرتا ہوں کہیں تم بھی جہنم میں نہ پہنچ جاؤ۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”وہ تو سنا ہے صرف ایک آدمی کو چاہتی تھی لیکن وہ گاؤں میں موجود رہا اور تمہاری بہن غائب ہو گئی۔“

”وہ تمہاری بہن تھی۔“ اُس نے کہا۔ ”آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟“

”نہ میرے بھائی! میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”تم میرے سوالوں کا جواب دو، مجھ سے سوال نہ پوچھو۔۔۔ میں تمہیں ایک بات کہہ دیتا ہوں۔ جھوٹ بولو گے تو خوش نہ ہونا کہ تم نے سچ پر وہ ڈال لیا ہے۔ سچ اپنے آپ سامنے آجاتے گا۔ بہتر ہے ابھی سے سچ بولنا شروع کر دو۔ کچھ باتیں تمہارا بھائی بنا گیا ہے، کچھ تمہاری ماں بتاتے گی، کچھ تمہارا باپ بتاتے گا۔ گاؤں کے کئی اور لوگ ہیں جو بہت سی باتیں جانتے ہیں۔ میں ان سب کو تھانے بلاؤں گا۔ تمہارا جھوٹ کھل کر سامنے آجائے گا۔“

”آپ کو صرف اس سوال کا جواب چاہیے کہ میری بہن کہاں ہے۔“

اُس نے بڑے رعب سے کہا۔ ”میرا جواب یہ ہے کہ مجھے معلوم نہیں۔ اور پوچھیں آپ کیا پوچھتے ہیں۔“

”تم اپنی بہن کو تلاش نہیں کرنا چاہتے؟“
”نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔

”کیوں؟“

”اُس لئے کہ وہ ہمیں مل گئی تو ہم اُسے جان سے مار ڈالیں گے۔“
اُس نے کہا۔

”تم اتنے غیرت مند ہوتے تو اُسے جان سے مار ڈالنے کے لئے تلاش کرتے۔“ میں نے کہا۔ ”تم بزدل ہو۔ تم ڈرتے ہو کہ جو آدمی اُسے لے گیا ہے، وہ تمہیں جان سے مار ڈالے گا۔“

”اُسے آپ ہمارے سامنے لائیں۔“ اُس نے کہا۔ ”پھر دیکھنا کون کے جان سے مارتا ہے۔“

میں نے دیکھا کہ دونوں بھائیوں کے دماغ میرے قبضے میں نہیں آ رہے۔ میں نے اور زیادہ دباؤ نہ ڈالا۔ یہ میرا شک تھا کہ اپنی بہن کو ان دونوں نے قتل کیا ہے۔ میرا شک زیادہ پختہ نہیں تھا۔ اگر یہ اتنے غیرت مند ہوتے تو اُس آدمی کو نہ چھوڑتے جس کے پیچھے ان کی بہن کسی اور کو اپنا خاوند قبول نہیں کر رہی تھی۔ میرے پاس شک کی وجوہات تھیں لیکن ان دونوں سے منوانا ابھی مشکل تھا۔

”وہ کس وقت گھر سے نکلی تھی؟“

”رات کو۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”صبح اُٹھ کر دیکھا۔ وہ چارپائی پر نہیں تھی۔“

”سب سے پہلے کس نے دیکھا تھا کہ وہ غائب ہے؟“

”ہماری ماں نے اور والد صاحب نے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”تم لوگوں نے گاؤں کے اُن گھروں میں جہاں وہ جایا کرتی تھی، دیکھا ہوگا۔“ میں نے پوچھا۔ ”انتظار کیا ہوگا کہ وہ واپس آجاتے گی؟“
”دیکھا تھا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”انتظار بھی کیا تھا۔“
”گھروں میں دیکھنے کون گیا تھا؟“

”ہماری ماں گئی تھی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”وہ کہیں نہ ملی۔“

”گاؤں والے پوچھتے ہوں گے کہ ممتاز کہاں ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”تم کیا جواب دیتے تھے؟“

”کہہ دیتے تھے کہ معلوم نہیں کہاں گئی ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”گاؤں میں کوئی ہم پر انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔“

میں اس کے ساتھ بھی لاش کی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ ان بھائیوں کو میں ابھی سو بچہ رہا تھا۔ بڑی مشکل تفتیش تھی۔ میں نے چھوٹے بھائی کو باہر بھیج دیا اور ان کی ماں کو بلایا۔

خوبصورت ماں

ماں اس عمر میں بھی خوبصورت تھی۔ سر کے دو چار بال ہی سفید ہوئے ہوں گے چہرے سے اُس کی اصل عمر کا پتہ چلتا تھا لیکن جوانی والی کشش کے آثار ابھی باقی تھے چہرے پر اُسی تھی۔ آنکھیں کچھ کچھ سو جی ہوئی تھیں اور ناک کی نوک سُرخ تھی۔ آنکھوں اور ناک سے پتہ چلتا تھا کہ وہ روتی رہی ہے۔ میں نے اُس کے ساتھ ہمدردی کی باتیں کیں اور تھکانے کی گھبراہٹ اُتارنے کے لئے ادھر ادھر کی گپیں لگائی۔ ”تمہیں کچھ تو اندازہ ہوگا کہ تمہاری بیٹی کس کے ساتھ گئی ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ پتہ نہیں۔“ اُس نے جواب دیا پھر مجھ سے پوچھا۔ ”آپ کو

کس نے بتایا ہے کہ میری بیٹی لاپتہ ہو گئی ہے؟... جب سپاہی ہیں بلانے آیا تو میں بہت خوش ہوئی کہ شاید میری بیٹی مل گئی ہے۔ سپاہی سے پوچھا تو اُس نے کہا کہ اُسے معلوم ہی نہیں کہ میں تھکانے کیوں بلایا گیا ہے؟“ میں نے اُس کے اس سوال کا جواب نہ دیا کہ مجھے اُس کی بیٹی کی

گمشدگی کی اطلاع کس نے دی ہے۔ میں نے کپڑے کا وہ ٹکڑا جو ہندو کاٹھیل لاش کی برآمدگی کی جگہ سے اٹھالایا تھا، اس عورت کے سامنے رکھ دیا اور مرنے والی بھی کپڑے کے ساتھ رکھ دی۔

ماں پہلے تو دونوں چیزوں کو ہاتھ لگاتے بغیر دیکھتی رہی اور میں اُس کے چہرے پر نظر سجا کر دیکھتا رہا۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدلنا لگا اور اُس کی آنکھیں کھلتی گئیں۔ اُس کے دونوں ہاتھ آگے بڑھنے لگے اور وہ آگے کو جھنجکی آتی۔ اُس نے کپڑا ایک ہاتھ میں اور مرنے والی کے ہاتھ میں لی اور ان چیزوں کو دیکھنے لگی۔ ایک آدھ منٹ بعد اُس نے میری طرف دیکھا۔

”کہاں ہے میری بچی؟“ اُس نے گھبراتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔ ”کہاں ہے؟ وہ زندہ ... نہیں ... وہ زندہ ہو گی۔“

”کیا یہ تمہاری بیٹی کی فیض کا کپڑا ہے؟“ جس رات وہ گھر سے گئی تھی، اُس نے اسی کپڑے کی فیض پر ہنسی دیکھی تھی۔ اُس نے کہا۔ ”یہی رنگ تھا اور پھول بھی یہی تھے ... اور یہ مرنے والی تو ہے ہی اسی کی۔ یہ میں نے خود اسے ہوا کر دی تھی۔“

میں نے جوتی کا وہ جوڑا بھی اُسے دکھایا جو بھنگن نے لاش کے پاؤں سے اُتار کر بہن لیا تھا۔ یہ عام قسم کی جوتی تھی جو دیہاتی عورتیں پہننا کرتی تھیں۔ ماں نے کہا کہ یہ جوتی اُس کی بیٹی کی ہو سکتی ہے لیکن میں نے سوچا کہ یہ تو کسی اور عورت کی بھی ہو سکتی ہے۔

”میری بیٹی کہاں ہے؟“ اُس نے اب کے روتے ہوئے آواز میں پوچھا۔

”میں ابھی یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”خدا کرے تمہاری بیٹی جہاں کہیں ہو، زندہ اور سلامت ہو بہت دن ہوئے ایک ویران جگہ سے ایک لاش ملی تھی لیکن اسے کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ چہرہ اور زیادہ تر جسم کھایا ہوا تھا۔ گیدڑوں، لکڑیوں وغیرہ نے

لاش کو کھایا تو کپڑے تار تار ہو گئے۔ میں دراصل یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ لاش کس کی تھی۔“

”دفن کر دی گئی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”وہ پہچانی نہیں جاتی تھی ... ضروری نہیں کہ وہ لاش تمہاری بیٹی کی ہو ... مجھے یہ بتاؤ کہ تم لوگوں نے بیٹی کے لاپتہ ہونے کی رپورٹ تھانے میں کیوں نہیں دی تھی؟“

”بیٹے نہیں مانتے تھے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”دونوں بیٹے کہتے تھے کہ وہ چلی گئی ہے تو اچھا ہے۔ بل گئی تو ماری جائے گی۔ میں رو رہا تھا کہ چپ ہو گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ بیٹے جو کہہ رہے ہیں وہ کر کے بھی دکھسا دیں گے۔ کون سی ماں چاہے گی کہ اُس کے بیٹے پھانسی چڑھ جائیں؟“

”تمہاری بیٹی کس طرح لاپتہ ہوئی تھی؟“

”میں اور میرا خاوند دوسرے گاؤں میں شادی پہلے گئے تھے۔“ اُس نے کہا۔ ”رات وہیں رہنا تھا۔ میں اگلے روز شام کو واپس آئی۔ بیٹوں نے یہ خبر سنائی کہ ممتاز کہیں چلی گئی ہے۔ اُنہوں نے بتایا کہ رات سوئی تھی۔ صبح نہیں تھی۔ میں نے سر پیٹ لیا۔ بیٹوں سے کہا کہ تھانے اطلاع دو۔ اُنہوں نے جو جواب دیا وہ آپ کو بتا چکی ہوں۔“

”تمہارا خاوند کیا کہتا تھا؟“

”میرے خاوند کی آپ کیا پوچھتے ہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اُسے خدا نے عقل دیتا ہے نہ موت۔ وہ تو صرف ہاں میں ہاں ملانا جانتا ہے۔“

مجھے تو معلوم تھا کہ ممتاز کے چاہنے والے تھے۔ یہ میں ماں پر ظاہر نہیں کر رہا تھا کہ مجھے معلوم ہے۔

”ماں اپنی بیٹی کی ساز دار ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تمہاری بیٹی کسی کو چاہتی ہو گی۔“

”ہاں۔“ اُس نے کہا۔ ”ایک آدمی ایسا ہے لیکن وہ گاؤں میں موجود تھا۔ اب بھی موجود ہے۔ اُس نے ممتاز سے تعلق توڑ لیا تھا۔“

اُس پر مجھے شک نہ ہوا۔ میں نے سب سے پہلے اُسی سے پوچھا تھا۔
میرے بیٹے مجھ سے پہلے ہی اُس سے پوچھ چکے تھے۔ اس کے علاوہ اور
کوئی ایسا آدمی نہیں جس پر ہم شک کرتے؟

ماں نے مجھے اپنے بیٹوں کے خلاف شک میں ڈال دیا۔ میں نے اس
کے چھوٹے بیٹے اقبال سے پوچھا تھا کہ گھر میں سب سے پہلے کسے پتہ چلا
تھا کہ اس کی بہن غائب ہے۔ اقبال نے جواب دیا تھا کہ اُس کی ماں اور
اُس کے باپ کو۔ اب ماں نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ کسی
دوسرے گاؤں میں تھی اور اگلے روز شام کے وقت واپس آتی تھی۔

میرے سامنے سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ لاش کس کی تھی۔ دوسرا
سوال یہ کیا یہ ممتاز کی لاش تھی؟ یہ تو میں نے فرض کر لیا تھا کہ یہ ممتاز
کی لاش تھی اُس کی میتھن کا ٹکڑا، مُر کی اور جوتی گواہی دے رہی تھیں۔
سب سے پہلے اس کی تصدیق ضروری تھی۔ تصدیق ہو جانے پر مجھے یہ
معلوم کرنا تھا کہ قاتل کون ہے۔

مجھے ایک خیال آگیا۔ میں نے ممتاز کے باپ اور بھائیوں کو تھانے
میں بیٹھا رہنے دیا اور ماں کو گھوڑی پر سوار کر کے اُس جگہ لے چلا جہاں
سے لاش برآمد ہوئی تھی۔ ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے لیا
تھا اور ایک کدال بھی ساتھ لے لی تھی۔

ٹوٹی ہوئی چوڑیاں

لاش ایسی جگہ دبائی گئی تھی جہاں کوئی عام گزر گاہ نہیں تھی۔ میں
نے کانسٹیبلوں سے کہا کہ اس جگہ سے تھوڑی تھوڑی مٹی ہٹائیں اور
میں اپنے متعلق آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میں جنوبی اور جنوبی
تھا۔ میں گہرائی میں جلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے لئے بڑا آسان
تھا کہ کچھ دنوں بعد ڈی۔ ایس۔ پی کو رپورٹ دے دیتا کہ لاش کے متعلق

کچھ پتہ نہیں چلا کہ یہ کس کی تھی لیکن میں اسے اپنی شکست سمجھتا تھا۔ مجھے
کچھ سراغ مل رہے تھے۔ میں نے اس یقین کے ساتھ تفتیش جاری رکھنے
کا فیصلہ کر لیا کہ یہ ممتاز کی لاش تھی۔

میں ممتاز کی ماں کو واپس تھانے لے گیا۔ اُس کا خاوند اور بیٹے
بہت پریشان تھے۔ میں سب کو اپنے دفتر میں لے گیا۔ ممتاز کی ماں رو
رہی تھی۔ اُس نے انہیں بتایا کہ بہت دن پہلے کھائی ہوئی ایک لاش ملی
تھی۔ اُس کی تمام نشانیاں ممتاز کی تھیں۔ اُس نے وہاں سے کپڑوں کے
اور چوڑیوں کے جو ٹکڑے اُٹھائے تھے اور سونے کا جو پتلا تھا، وہ سب
کو دکھا کر کہا کہ یہ ساری چیزیں ممتاز کی ہیں۔

”وہ خود نہیں مری“۔ میں نے کہا۔ ”اُسے قتل کیا گیا ہے۔ اگر
اُسے خودکشی کرنی ہوتی تو گھر میں کرتی یا گاؤں کے قریب کرتی۔ اتنے
دُور اگر خودکشی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ سوچنے والی بات یہ ہے
کہ اُس کی لاش کو زمین میں کس نے دبایا تھا؟... کیا ہمارا کوئی دشمن ہے؟“
”نہیں“۔ ممتاز کے بڑے بھائی نے کہا۔ ”ہم معلوم کر
لیں گے۔“

”ہاں، معلوم کر سیں“۔ میں نے کہا۔ ”تم سب اپنے گاؤں چلے
مٹی کو اس طرح دیکھیں جیسے سوئی ڈھونڈنی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ کچھ نہ کچھ
مل جائے گا۔“

کانسٹیبلوں نے اُس جگہ سے مٹی ہٹا کر اور ہاتھ مار مار کر مٹی کی
تلاشی یعنی شروع کر دی۔ میں خود مٹی کو دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے
کچھ ملنا شروع ہو گیا۔ یہ چوڑیوں کے ٹکڑے تھے۔ کپڑوں کے ٹکڑے بھی
ملے۔ ماں بھی مٹی میں ہاتھ مارنے لگی۔ اُسے ایک اور چیز مل گئی۔ یہ پان
کے پتے کی شکل کی سونے کی پتری تھی جس میں ننگ جڑے ہوئے تھے۔
یہ کالے دھاگے میں پروتی ہوئی تھی۔ یہ زیور کی ایک آٹم تھی۔

”میری بیٹی یہ پتا لگے میں ڈالے رکھتی تھی۔“ ماں نے مجھے بتایا

دیر بعد شفاعت آگیا۔ صرف میں جانتا تھا کہ اس کا نام شفاعت ہے۔
 باقی سب اُسے ہندو سا دھوسجھتے تھے۔ وہ بہت پریشان تھا۔ میں سمجھا
 وہ کوئی نئی خبر لایا ہو گا لیکن وہ اپنا رونا رونے آیا تھا۔
 ”میری جان خطرے میں پڑ گئی ہے۔“ اُس نے کہا۔

”کوئی تمہیں قتل کرنا چاہتا ہے؟“
 ”میں شاید خود ہی اپنے آپ کو قتل کر دوں گا۔“ اُس نے کہا
 — ”وہ سب میری جان لینا چاہتے ہیں۔۔۔ ایک تو وہ مخلوق ہے جس سے
 میں نے الٹا کام کرایا تھا۔ میں نے شکوری کو گھر سے نکلوا دیا تھا۔۔۔“
 مجھے غصہ آگیا۔ وہ آخر جراتم پیشہ آدمی تھا۔ میں نے اُسے اپنے مطلب
 کے لئے دوست بنایا تھا اور مخبر کے طور پر اسے استعمال کرنا تھا لیکن
 وہ میرے سر چڑھتا جا رہا تھا۔

”تم میرا مغز چاٹنے کیوں آگے ہو؟“ میں نے اُسے کہا۔
 ”ایک بار سن لیا ہے کہ تم نے اُس لڑکی کو اپنے علم کے زور پر گھر سے نکلوا دیا
 تھا۔ بار بار کیوں سنائے آ رہے ہو؟ مجھے اور بھی بہت سے کام کرنے
 ہیں۔ کوئی خاص بات ہو تو مجھے بتانے آ جایا کرو یا میرے بلانے
 پر آیا کرو۔“

”میری بات سن لے ملک! میری بات سن لے!“ اُس نے
 بڑے پریشان سے لہجے میں کہا۔ ”مجھے حالات میں بند کر لے، وہ مجھے
 زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

ایک تو اُسے میرے ساتھ باتیں کرتے دورہ سا پڑا تھا۔ دوسرا
 دورہ اُسے اُس وقت پڑا جب وہ میرے کانسٹیبل کے ساتھ اپنی گفٹ
 کو جا رہا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اب اُسے کیا ہوا ہے۔

”رات میں بڑی گہری نیند سوا ہوا تھا۔“ اُس نے ڈر سے ہوتے
 لہجے میں بتایا۔ ”کسی نے مجھے بڑی زور سے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ میں اُٹھ
 بیٹھا مجھے گفٹ میں اپنے چیلوں کے خراٹے سنائی دے رہے تھے۔ میرا دل

اور وہ بے قابو ہو کر رونے لگی۔
 کانسٹیبلوں نے نیچے کی مٹی اُڑ پر کر دی۔ کپڑے کے ٹکڑوں
 اور ٹوٹی ہوئی چوڑیوں اور سونے کے پتے کے سوا اور کچھ نہ ملا۔ مال کو
 یقین ہوتا جا رہا تھا کہ یہ ممتاز کی چیزیں ہیں۔

میں آپ کو زیادہ باریکچوں میں اور ذرا ذرا سی تفصیل میں نہیں
 لے جا رہا۔ میں ہر چیز کے متعلق ممتاز کی ماں سے کتنی کتنی سوال پوچھتا تھا
 اُس کے جواب بڑے صاف تھے۔ ان سے مجھے بھی یقین ہونے لگا
 کہ یہ ممتاز کی لاش تھی، لیکن قانون اس عورت کے اور میرے یقین کو
 تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اس قسم کی لاش کی شناخت کے کچھ اور تقاضے
 ہوتے تھے۔

جاؤ۔ گاؤں سے غیر حاضر نہ ہونا۔
 وہ سب چلے گئے۔

لاش میرے علاقے سے برآمد ہوئی تھی اور تفتیش دوسرے تھانے
 کے علاقے میں کرنی تھی۔ اُس تھانے کا انسپراج سب انسپکٹر معین الدین خان
 تھا۔ دراصل اُسے بھی میرے ساتھ رہنا تھا لیکن اُس نے مجھے کہا
 کہ میں ہی تفتیش میں لگا رہوں۔ میں اُسی روز اُس کے پاس چلا گیا اور
 اُسے اپنا سکہ بتایا۔ اُس نے کہا کہ وہ مجھے بڑے پختہ مخبر دے گا۔
 بہر حال معین الدین خان کے ساتھ جو باتیں ہوتیں اور اس سلسلے میں
 جو قواعد و ضوابط کے مطابق کارروائی ہوتی اسے آپ مجھ تک ہی رہنے
 دیں۔ میں آپ کو کہانی سناتا ہوں اور یہ بتا دیتا ہوں کہ میں نے
 دوسرے تھانے کی بجائے اپنے تھانے میں تفتیش جاری رکھی میرے
 لئے اسی میں سہولت تھی۔

میں نے دوسرے دن گاؤں کے منبردار کو پیغام بھیجا کہ وہ متو
 نام کی عورت کو ساتھ لے کر تھانے آجائے۔
 میں نے تھانے کے دوسرے کاموں کی طرف توجہ دی۔ پھوٹری

بڑی زور سے دھڑک رہا تھا۔ گف کے باہر کسی کا قہقہہ سنائی دیا۔ میں باہر نکلا۔ باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ آدھی رات گزر گئی تھی۔ پچھلی رات کا چاند پوری طرح روشن تھا۔ دائیں طرف سے مجھے زور کا دھک لگا۔ میں گف کے دہانے کے کنارے سے جا لگا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہی چیزیں ہیں جنہوں نے میرے عمل پر کام کیا تھا۔ اب یہ چیزیں مجھے سزا دینے آگئی ہیں۔ میں نے آپ کے پاس بیٹھے ہوتے انہیں دیکھا تھا۔ دیکھا نہیں، ان کی موجودگی کو محسوس کیا تھا پھر گف کی طرف آتے ہوئے یہ چیزیں مجھے ڈرانے آگئیں اور رات کو پھر آگئیں۔“

وہ جس مخلوق کا ذکر کر رہا تھا، اسے میں چیزیں کہہ رہا ہوں۔ وہ انہیں مکمل بھی کہتا تھا اور کچھ اور نام بھی لیتا تھا۔ مجھے اُس کی اصطلاحیں یاد نہیں رہیں۔ میں اُس کی رام کہانی اپنے الفاظ میں سنارہا ہوں۔ ”پیسے کے لالچ نے مجھے مروایا ہے ملک صاحب!“ اُس نے کہا۔ ”ایسے اُلٹے عمل کسی استاد کو ہی کرنے چاہئیں۔ استاد کے پاس ان کا توڑ بھی ہوتا ہے۔ میرے ہاتھ میں اب کچھ بھی نہیں۔ چرس اور شراب ہے۔ میں نے باقی رات چرس پیئے گزاری ہے لیکن نہ نیند آتی نہ نشہ ہوا۔ گف کے باہر مجھے قہقہے بھی سنائی دیتے رہے اور چیخیں بھی۔ دو مرتبہ ایسے ہوئے کہ میرے سر پر پتھر پڑا جس سے میرا سر جھکا گیا۔“

میں کام کاج چھوڑ کر اُس کی بات غور سے سننے لگا۔ وہ بُری طرح خوفزدہ تھا۔ اُس کی زبان ہلکا جاتی تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں جنات اور چڑیلوں کو ماننا سمجھتا یا نہیں، یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ شخص ڈرانے سے رو عمل سے گزر رہا تھا۔ میرا علم نفسیات کا کچھ مطالعہ تھا۔ اس علم میں مجھے بہت دلچسپی تھی۔ سر دس میں اور تفتیش میں نفسیات کے مطالعے نے میری بہت مدد کی ہے۔ میں شفاعت کا یہ رو عمل نفسیات کی روشنی میں سُن رہا تھا۔

آٹھ دن کی قہمہلت

ایک تو اُسے یہ پُر اسرار اور غیر مرئی مخلوق ڈرا رہی تھی، دوسرے اُس پر یہ افتادہ پڑی کہ رات اُس نے اس مصیبت میں گزار دی اور صبح شکوری کا منگیزر نامک زیر احمد اُس کی گف میں جا دھکا۔

نامک زیر پکا فوجی اور اصل غیرت مند تھا۔ وہ شکوری کے پیچھے رُحمے رہزن کے ٹھکانے پر جا پہنچا تھا۔ اُس نے مجھ پر بھی رعب جمانے کی کوشش کی تھی۔ اُس کے ماں باپ نے شکوری کے ساتھ کی ہوتی اُس کی منگنی توڑ دی تھی لیکن زیر کو یقین ہو گیا کہ شکوری پاک صاف اور مظلوم ہے تو اُس نے اپنے ماں باپ کے فیصلے کی پرواہ کی تھی نہ اپنی برادری کی نہ اس کی کہ گاؤں کے لوگ کیا کہیں گے۔ اُس نے اعلان کر دیا کہ وہ شکوری کے ساتھ شادی کرے گا۔ اُسے جب تھکانے سے پتہ چلا تھا کہ اس سا دھوا (شفاعت) نے شکوری کو کالے علم کے ذریعے گھر سے نکلوا دیا ہے تو زیر نے مجھے کہا تھا کہ اسے باقی عمر جیل میں ہی رکھنا۔ جس روز یہ باہر آئے گا، میرے ہاتھوں قتل ہو جائے گا۔

شفاعت نے مجھے سُنایا کہ رات بھر اُسے ”جن اور چڑیلوں“ ڈراتی رہیں اور صبح نامک زیر جا پہنچا۔ زیر کو کسی طرح پتہ چل گیا ہو گا کہ سا دھو کو تھکانے سے جھپٹی مل گئی ہے اور وہ اپنی گف میں آ گیا ہے۔ نامک زیر پٹی جھٹی آیا ہوا تھا۔ اُس زمانے میں فوجیوں کو ہر سال ڈیڑھ مہینہ جھٹی ملا کرتی تھی۔ ہر تیسرے سال تین ماہ کی جھٹی ملتی تھی جسے فرلو

FURLOUGH

کہتے تھے۔ زیر فرلو آیا ہوا تھا۔ ”تم نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔“ نامک زیر نے شفاعت سے کہا۔ ”میں تمہیں ایک رعایت دیتا ہوں۔ دس دن کے اندر اندر یہاں سے

چلے جاؤ۔ اگر نہ گئے تو لوگ یہاں سے تمہاری لاش اٹھائیں گے۔“
شفاعت نے نائمک زبیر کو اپنے پُر اسرار علم اور جنات سے ڈرانے کے لئے اپنی اصطلاحوں اور اپنے انداز سے بات کی۔

”میں کو شش کروں گا کہ تم میرے ہاتھوں خراب ہونے سے بچے رہو۔“ شفاعت نے اُسے کہا۔ ”تم نے دیکھ لیا ہے میں کیا کر سکتا ہوں کیا تم مان نہیں رہے کہ تمہاری منگیتر کو میں نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا؟ کیا تمہیں تھاں دینے نہیں بتایا تھا کہ تمہاری منگیتر کو اس گورونے

غائب کیا تھا؟ جا، تھاں دینے سے پوچھ، اُس نے مجھے گرفتار کیوں نہیں کیا؟ مجھے سزا کیوں نہیں دلائی؟ تھاں دینے کیا چیز ہے؟ میں نے قانون کو اندھا کر دیا ہے۔ جا، بڑے سے بڑے انگریز انٹر کو یہاں لے آ دیکھ لینا، وہ آتے آتے مجھے پکڑ لے لیکن میرے پاؤں جھوکر واپس چلا جائے گا۔“

”میں نے تجھے دس دنوں کی ٹہلت دی ہے۔“ نائمک زبیر نے ایسے کہا جیسے اُس نے اس سادھو کی بات سنی ہی نہ ہو۔ بولا۔ ”اب آٹھ دنوں کی ٹہلت دیتا ہوں۔ اپنے آپ کو یہاں سے زندہ لے جا۔ تیرے قاتل کا کسی کو پتہ نہیں چلے گا.... اور سن کافر کی اولاد! علم جو میرے پاس ہے، اس کے سامنے تیرا جادو نہیں چل سکتا۔ میرے پاس اللہ کا کلام ہے تو چر سی سادھو میرے اللہ کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔“ نائمک زبیر جالے کے لئے اٹھا اور یہ کہہ کر چلا گیا۔ ”آٹھ دن آج پہلا دن ہے۔“

شفاعت نے مجھے بتایا کہ نائمک زبیر جیسے آدمیوں سے وہ ڈرنے والا نہیں تھا لیکن وہ پہلے ہی ڈرا ہوا تھا، وہ اور زیادہ ڈر گیا۔

”میں نے اپنے آپ میں ایسی کمزوری محسوس کی جیسے یہ فوجی مجھ پر اپنا جادو چلا گیا ہے۔“ شفاعت نے مجھے سنایا۔ ”میں نے اُسے ڈرانے کی کوشش کی تھی لیکن میں خود ڈر رہا تھا۔“

”مجھے یہ بتاؤ کہ میرے پاس کیا لینے آتے ہو۔“ میں نے اُس سے پوچھا۔ ”میرا ہتھیں اس مخلوق سے تو نہیں بچا سکتا جو تمہیں ڈرانے

آتی ہے۔“ میں نے ہنسنے ہنسنے کہا۔ ”نائمک زبیر سے بھی میں نہیں محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ اُسے میں اُس وقت پکڑوں گا جب وہ تمہیں قتل کر چکے گا۔“

”میں نہیں سمجھ سکتا کہ میں آپ کے پاس کیوں آ گیا ہوں۔“ اُس نے اُٹھ کر بے ہوشی سے لہجے میں کہا۔ ”ملک صاحب! میں شاید آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ مجھے ایسے نظر آ رہا ہے جیسے میری زندگی ختم ہو چکی ہے۔ اگر اس فوجی نے مجھے قتل نہ کر دیا تو یہ مخلوق مجھے مار ڈالے گی۔“

”تم اپنے استاد کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے؟“ اُس سے الگ ہوتے کئی سال گزر گئے ہیں۔ اُس نے جواب دیا۔ ”ایک بار پتہ چلا تھا کہ وہ اُس جگہ سے کہیں چلا گیا ہے۔“

”کیا تم نائمک زبیر کی دھمکی سے ڈر کر یہاں سے چلے جاؤ گے؟“

”نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اپنا اڈہ نہیں چھوڑوں گا۔“

اُس نے ذرا سوچ کر پوچھا۔ ”کیا آپ میری اس رپورٹ پر کوئی کارروائی نہیں کر سکتے کہ زبیر نے مجھے قتل کی دھمکی دی ہے؟ قانون اُس کے ہاتھ میں تو نہیں کہ وہ ڈرا دھمکا کر مجھے اس علاقے سے نکالنا چاہتا ہے؟“

میں نے اُس کی اس شکایت پر غور کیا تو میں نے محسوس کیا کہ زبیر کو میں ذرا ڈرا دوں۔ میں نے زبیر کو دلچسپی طرح دیکھا تھا۔ وہ قتل کرنے کی ہمت رکھتا تھا، بلکہ مجھے یوں کہنا چاہتے کہ وہ اُلٹی عقل کا آدمی تھا۔ مجھے شفاعت کے ساتھ ایسی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ قتل نہ ہو، نہ ہی مجھے نائمک زبیر احمد کے ساتھ دلچسپی تھی کہ وہ قتل کرے گا تو اُسے سزائے موت یا

عمر قید مل جاتے گی۔ میری دلچسپی اپنے آپ سے تھی۔ میرے علاقے میں قتل کی واردات نہیں ہونی چاہیے تھی۔ میں اپنے آپ کو ایک اور تفتیش سے بچانا چاہتا تھا۔

میں نے شفاعت سے کہا کہ وہ واپس چلا جاتے۔ وہ چلا گیا تو میں نے نائمک زبیر کو بلالانے کے لئے ایک کانسٹیبل کو بھیجا۔

بھی ہیں ہمیں پتہ چلا ہے کہ یہ ساڈھو اصل میں ساڈھو نہیں۔ کوئی
دوسرا ہے؟

”کس نے یہ خبر دی ہے؟“

”بنارس اور ہردوار میں کئی بار ساڈھو کپڑے گتے ہیں جو مسلمان
تھے۔ دوسرے ہندو لے کہا۔“ مسلمان اور کچھ بھی ساڈھوؤں کا
بہروپ دھار کر ہندو عورتوں سے پیسے بھی لیتے ہیں اور انہیں خراب
بھی کرتے ہیں۔ ان کی عزت کے ساتھ کھلتے ہیں۔ ہمیں شک ہے کہ یہ
ساڈھو بھی بہروپ یا برعاش ہے۔ آپ نے اسے کسی شک میں تھانے
بلایا ہوگا۔ اگر آپ اس کی اصلیت سے واقف ہو گئے ہیں تو ہمیں بتادیں
اس کے اڈے پر ہماری عورتیں جاتی ہیں؟“

مجھے اچانک ایک سوچ آگئی۔ وہ یہ کہ میں ان کی عورتوں کی
عزت بچانے کا تردد کیوں کروں؟

”منہیں لالہ جی!“ میں نے ان ہندوؤں سے کہا۔ ”میں نے
آپ کے گوروں کو کسی شک میں تھانے نہیں بلایا تھا۔ آپ کو
معلوم ہوگا کہ ایک مسلمان لڑکی (شکوری) لاپتہ ہو گئی تھی۔ جوان لڑکی یا
لڑکے کو تلاش کرنا آسان تو نہیں ہوتا۔ تھانے میں مجھے کسی نے بتایا
کہ یہاں ایک ساڈھو رہتا ہے جس کے پاس کوئی علم ہے۔ اس سے وہ
بتا دیتا ہے کہ گمشدہ فرد کہاں ہے۔ میں نے ساڈھو مہاراج کی منت کی
کہ گمشدہ لڑکی کا تاپتہ بتادیں۔ انہوں نے اپنا عمل چلا کر معلوم کر لیا کہ
لڑکی کہاں ہے۔ آپ مسلمانوں کے محلے میں جا کر دیکھیں۔ وہ لڑکی واپس
آگئی ہے۔ آپ کسی وہم میں نہ پڑیں۔ یہ ساڈھو مہاراج صحیح ساڈھو اور
تارک الدنیا ہیں اور ان کے ہاتھ میں بڑی طاقت ہے۔“

یہاں میں آپ کو ہندو ساڈھوؤں اور ہندو عورتوں کے متعلق
ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ ہندوؤں کی اکثر جوان عورتیں ان ساڈھوؤں
کے پاس جایا کرتی تھیں اور انہیں اپنا جسم پیش کرتی تھیں۔ ایک تو

ساڈھو ہندو عورتوں کو خراب کرتا ہے

منازکے گاؤں کے ہندو وار اور متونام کی عورت کو تھانے لالے
کے لئے ایک کانشیل کو بھیج رکھا تھا۔ وہ گاؤں دور تھا۔ زبیر کا گاؤں قریب
تھا۔ میں دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

قبضے کے دو ”معتز“ ہندو آگئے۔ یہ وہی تھے جو اس وقت میرے
پاس آتے تھے جب میں نے شفاعت کراملی ساڈھو سمجھ کر مشتبہ کے طور
پر تھانے بلایا تھا۔ انہوں نے مجھے کہا تھا کہ ساڈھوؤں کو وہ مقدس
سمجھتے ہیں اور میں نے ایک ساڈھو کو تھانے میں بٹھالیا ہے۔ میں نے
انہیں کہا تھا کہ قانون کے تقاضے پورے کرنے کے لئے میں اپنے
مذہب کی بھی پرواہ نہیں کیا کرتا، یہ تو ایک ساڈھو ہے۔ اتنے میں شفاعت
ساڈھو نے چرس کے نشے سے ٹوٹا ہوا ہونے کی وجہ سے نیکی گالیاں بکڑ
شروع کر دی تھیں۔ ان ہندوؤں نے گالیاں سن کر مجھ سے پوچھا تھا
کہ یہ کون ہے، یہ تو کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ
یہ آپ کے ساڈھو مہاراج ہیں اور چرس مانگ رہے ہیں۔ دونوں ہندو
کھیلے سے ہو کر چلے گئے تھے۔ اب اتنے دنوں بعد وہ پھر آگئے۔ میر
نے انہیں احترام سے بٹھایا اور پوچھا کہ وہ کیوں آتے ہیں۔

”یہ جو ساڈھو مہاراج آپ کے پاس تھانے میں رہے ہیں، ان کے
متعلق کچھ معلوم کرنا ہے۔“ ایک ہندو نے کہا۔

”میں ان کے متعلق کیا بتا سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ تو
آپ کے ساڈھو مہاراج ہیں ... آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟“
”مجھے آپ کے بھی ہوتے ہیں۔“ اس ہندو نے کہا۔ ”مجھے چاہئے

اسے وہ اپنا بلیڈ ان (نذرانہ یا قربانی) سمجھتی تھیں، دوسری وجہ یہ تھی کہ ہندوؤں کا پیشہ تجارت اور دکانداری تھا۔ وہ فطری طور پر کاروباری تھے۔ ان کا پیار پیسے سے تھا۔ کجوسی ان کی فطرت میں تھی۔ زندہ دلی نام کو نہیں سمجھتی۔ ان کے جسم موٹے، بھدے اور پلپلے تھے۔ دکانوں پر بیٹھ بیٹھ کر ان کے پیٹ بڑھ آتے تھے۔

ان کے مقابلے میں ان کی عورتیں، خصوصاً جوان لڑکیاں خوبصورت، نیز طرار اور جسمانی لحاظ سے دلکش تھیں۔ ان کے موٹے، بھدے اور مردہ دل خاوندانہ نہیں دلی تسکین دے سکتے تھے۔ جسمانی، اس لئے یہ عورتیں ان سادھوؤں کے پاس جایا کرتی تھیں۔ ان میں شرم و حیا نہیں تھی۔ ان کے خاوند سب کچھ جانتے ہوئے بھی چپ رہتے تھے، لیکن وہ یہ برداشت نہیں کرتے تھے کہ ان کی عورتیں مسلمانوں کے ساتھ ناجائز تعلق رکھیں۔ یہ دو ہندو یہی غم لے کر آتے تھے کہ یہ سادھو مسلمان بہرہ و پیارے اور ہندو عورتیں ناپاک ہو رہی ہیں۔ میں نے جھوٹ بول کر ان کی تسلی کر دی۔ دونوں ہندو چلے گئے لیکن میں خوش نہ ہوا۔ تھانے میں کوئی ان کا مخبر تھا جس نے انہیں بتا دیا تھا کہ یہ شخص سادھو نہیں سادھو بنا ہوا ہے۔ البتہ اس کی مجھے ضرور خوشی ہوئی کہ میں نے ان ہندوؤں کو گمراہ کر دیا تھا۔ میں شفاعت کو ان سے نہیں بچا رہا تھا، میں چاہتا یہ تھا کہ ان ہندوؤں کی عورتیں اس سادھو کے پاس جاتی رہیں۔

شاید بعض حضرات میری اس حرکت کو پسند نہیں کریں گے لیکن میں ہی جانتا ہوں کہ ہندو کس قدر کمینہ قوم ہے اور مسلمانوں کو یہ کیسے کیسے گھسٹا طریقوں سے نقصان پہنچایا کرتے تھے۔

مجھے علی رضا کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُس نے اپنے کتے کی سزا پاتی تھی۔ میں اپنی دلچسپی کی خاطر معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کس حال میں ہے۔ کچھ دن پہلے اُسے ہسپتال لے گئے تھے۔ میں پہلے سنا چکا ہوں کہ جسے رہزن نے اُس کو کس حال تک پہنچا دیا تھا۔ میں ویسے ہی سرکاری

ہسپتال چلا گیا۔ ڈاکٹر کے ساتھ کپ شپ لگا کر علی رضا کے متعلق پوچھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اُس نے علی رضا کو صرف ایک دن اور ایک رات ہسپتال میں رکھا تھا۔ اگلے روز اُسے دوائیاں دے کر گھر بھیج دیا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ جس کسی کی قید میں رہا تھا، اُس نے اسے بالکل بھوکا رکھا تھا۔ علی رضا نے ڈاکٹر کو بتایا تھا کہ اُسے صرف پانی پلایا جاتا تھا۔ اُسے شک تھا کہ پانی میں کچھ ملا ہوا ہوتا تھا۔ ڈاکٹر نے یہ بھی بتایا کہ اسے ادیتیں دی جاتی رہیں۔ ان سے اُس کے دماغ پر بھی اثر تھا۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ اُس کا دماغ صحیح نہیں ہو سکے گا۔ دن میں تین چار مرتبہ اُسے ایسا دورہ پڑتا تھا کہ قبضے لگتا تھا۔ پھر بچوں کی طرح رونے لگتا تھا۔ اس میں کچھ جسمانی نقص بھی پیدا ہو گیا تھا۔

میں جب ہسپتال سے واپس آیا تو نانک زبیر احمد کو تھانے میں آئے آٹھ دس منٹ ہو گئے تھے۔ میں اُسے اپنے دفتر میں لے گیا۔

”شادی کب کر رہے ہو زبیر؟“ میں نے پوچھا۔

”چار روز بعد“ اُس نے جواب دیا۔ ”دن مقرر ہو گیا ہے۔ آپ کو بلاؤں تو آپ آئیں گے؟“

”منہیں زبیر!“ میں نے کہا۔ ”میرا آنا ٹھیک نہیں.... اور سنو زبیر بھاتی! شادی کرو اور مزے سے زندگی بسر کرو۔ کسی کو قتل کی دھمکی دینا جرم ہے۔“

”کیا وہ سادھو آپ کے پاس شکایت لے کر آیا تھا؟“ اُس نے پوچھا۔

”ہاں“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ شکایت لے کر آیا تھا۔ وہ تو باتا عدہ رپورٹ درج کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اُسے ہلکا پھلکا بھیج دیا ہے۔ اگر میں رپورٹ درج کر لیتا تو میں تم سے ضمانت مانگتا۔ تم میرے مسلمان بھاتی ہو۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہاری عزت بچ گئی ہے۔“

”اگر آپ ممانت مانگیں گے تو بھی میں اُسے قتل کر سکتا ہوں۔“
 اُس نے کہا۔ ”میں سچی بات کہنے والا آدمی ہوں جناب! میں آپ کے
 کہنے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا لیکن میرا مانع بگڑ گیا تو سادھو
 کی خیر نہیں.... آپ کیسے مسلمان ہیں؟ ایک ہندو نے ایک مسلمان لڑکی
 کو غیر مردوں تک پہنچا دیا تھا۔ آپ میری جگہ ہوئے تو کیا برداشت کر لیتے؟
 اُس کی موت میرے ہاتھوں کھٹی گئی ہے۔“
 ”وہ سزا جگت رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے خود ہی مجھے
 بتایا تھا کہ رُحمے رہزن نے تمہیں کہا تھا کہ سادھو پر اپنے ہی عمل کا اُلٹا
 اثر شروع ہو چکا ہے۔“
 میں نے اُسے پوری تفصیل سے سنایا کہ سادھو کا کیا حال ہو
 رہا ہے۔

”وہ ہوگا۔“ زبیر نے کہا۔ ”اگر وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا تو ٹھیک
 ہے ورنہ میں اُسے انجام تک پہنچاؤں گا.... میں آپ کو ایک بات بتانا
 چاہتا ہوں۔ مجھے رُحمے نے سچی باتیں بتاتی تھیں لیکن میں نے اُس وقت
 پوری توجہ نہیں دی تھی۔ مجھے میری بہن اور ماں بتاتی ہیں کہ میری منگیتر
 (شکوری) اللہ اللہ کرتی رہتی ہے۔ پہلے بھی مذہب کی پوری پابندی کرتی
 تھی، اب پہلے سے زیادہ کرتی ہے۔ لوگوں کی زبانیں بند نہیں کی جاسکتیں۔
 جس کے منہ میں جو آتا ہے وہ بکتا ہے۔ دو آدمیوں کے ساتھ میری لڑائی
 بھی ہوتی ہے۔ شکوری نے مجھے دو تین بار پیغام بھیجا ہے کہ میرے ساتھ
 جس نے یہ ذلیل حرکت کی ہے اُسے خدا سزا دے گا، تم لوگوں کے
 گلے نہ پڑو۔ اُس نے یہ بھی کہا ہے کہ میں کسی کو بددعا نہیں دوں گی
 لیکن مجھے معلوم ہے کہ خدا انہیں سچے گناہیں....

”علی رضا کی حالت کبھی آکر دیکھنا۔ کل گندگی کے ڈھیر پھینکا ہوا
 سے گندگی اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر پھینک رہا تھا۔ اُس کا باپ اُسے
 اٹھا کر گھر لے گیا۔ علی رضا انسان کو انسان نہیں سمجھا کرتا تھا۔ وہ خوبصورت

عورتوں کا شکاری تھا۔ اب اُس کی داڑھی بڑھی ہوئی ہے۔ کپڑے
 میلے کچیلے پہنے رکھتا ہے۔ کبھی ہنستا ہے کبھی روتا ہے.... سادھو کی
 حالت آپ خود بتا رہے ہیں۔“
 میں نے نامک زبیر احمد کو ایک بار پھر کہا کہ وہ کسی سے نہ لڑے
 نہ کسی کو دھمکیاں دے، لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ وہ میری بات سمجھنے کی
 کوشش نہیں کر رہا تھا۔

”جناب عالی!“ اُس نے کہا۔ ”مجھے جب خیال آتا ہے کہ سادھو
 یہاں قریب موجود ہے تو میں اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتا، اسی لئے میں
 نے اُسے کہا ہے کہ وہ یہاں سے چلا جائے۔ آپ اُسے کہیں وہ چلا جائے؟
 نامک زبیر جب جالے لگا تو اُس نے اکھڑ فوجی کی طرح کہا۔
 ”اُسے وہاں سے اُٹھا دیں۔ اُس نے جادو چلایا ہے، میں کچھ اور چلاؤں گا۔“

منگیتر نے قتل کیا تھا؟

ممتاز کے گاؤں کا نمبر دار متو کو ساتھ لے کر آگیا۔ میں نے پہلے
 نمبر دار کو اپنے پاس بٹھایا اور اُسے کہا کہ ممتاز کی گمشدگی کے متعلق
 کچھ بتاتے۔

”لڑکی ایسی نہیں تھی۔“ اس ہندو نمبر دار نے کہا۔ ”منور نام
 کا ایک آدمی ہے جسے وہ چاہتی تھی لیکن ممتاز اور منور کو کہیں ملتے ملتے
 کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ ممتاز کی ماں اور ممتاز منور کے گھر جاتی تھیں۔
 منور وہی آدمی تھا جسے ممتاز چاہتی تھی اور ماں سے کہتی تھی کہ
 وہ منور کے سوا کسی اور کو قبول نہیں کرے گی۔“

”کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ممتاز کو منور نے گھر سے نکلوا دیا ہو؟“
 میں نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ منور نے اُسے نہیں نکلوا دیا۔“ نمبر دار نے جواب

دیا۔ ”وہ تو بیمار پڑا ہے۔ اب اچھا ہو گیا ہے۔“ نمبر دار نے پوچھا۔
 ”اُڑتی اُڑتی سُنی ہے کہ ممتاز کی کہیں سے لاش ملے گی۔ کیا یہ صحیح ہے؟“
 ”ہاں، یہ صحیح ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے ایک بات معلوم کرنی ہے۔“
 ممتاز منور کو چاہتی تھی اور ممتاز کی منگنی کسی اور سے کر دی گئی تھی۔ اکثر
 ایسے ہوتا ہے کہ دلیر لڑکیاں اپنے منگیتروں کو پیغام بھجوادی ہیں کہ وہ
 انہیں قبول نہیں کریں گی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ممتاز نے اپنے منگیتر کو ایسا
 ہی پیغام بھجوادیا ہو اور منگیتر نے اُسے قتل کر دیا ہو؟“
 ”میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔“ نمبر دار نے کہا۔ ”اب
 نے جس عورت کو بلایا ہے، یہ آپ کو راز کی بہت سی باتیں بتا دے گی۔
 مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ نے کیوں بلایا ہے۔ پہلے معلوم ہوتا تو میں
 کچھ معلوم کر کے آتا۔“

”ممتاز کے بھائی، فیروز اور اقبال کیسے ہیں؟“

”امیر باپ کے بیٹے ہیں۔“ نمبر دار نے جواب دیا۔ ”ذات بھی
 اونچی ہے۔ اپنا رعب داب رکھتے ہیں۔ کوئی اونچی بات کرے تو اُس کی
 بڑی پسلی ایک کر دیتے ہیں۔ صرف ماں ہے جس سے ڈرتے ہیں۔ منور کے
 ساتھ ممتاز کی شادی ہو سکتی تھی لیکن ماں نے نہیں ہونے دی۔“
 ”وہ تو پتہ چلا ہے کہ منور کی ذات ان لوگوں سے کمتر تھی۔“
 میں نے کہا۔

”بالکل غلط ہے جی!“ نمبر دار نے کہا۔ ”ایک ہی ذات ہے۔
 ایک ہی برادری ہے۔ منور کا خاندان بھی بڑی زمینداری والا خاندان ہے۔
 منور اُس آدمی سے زیادہ خوبصورت جوان ہے جس کے ساتھ ممتاز کی
 منگنی ہوتی ہے۔“

”تم کہتے ہو کہ ممتاز کے بھائی بڑے رعب داب والے ہیں۔“
 میں نے کہا۔ ”پھر منور اُن سے کس طرح بچا رہا؟ انہیں معلوم ہو گیا تھا
 کہ اُن کی بہن منور کو چاہتی ہے اور اُس سے کہیں ملتی ملاتی بھی ہوگی۔“

”میں اس سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔“ نمبر دار نے کہا۔ ”ممتاز
 کی ماں منور کو بہت چاہتی ہے۔ وہ اپنی بیٹی کو بُرا بھلا کہہ لیتی ہے منور
 کے خلاف کوئی بات نہیں کرتی۔ اُس نے اپنے بیٹوں سے بھی کہہ رکھا ہے
 کہ منور اچھا آدمی ہے، اپنی بیٹی اُسے خراب کر رہی ہے۔۔۔۔۔ اُس میں
 کوئی شک نہیں کہ منور امیر خاندان کا بیٹا ہوتے ہوئے شریف لڑکا ہے۔
 میں نے مثنو سے پوچھ کر زیادہ بہتر سمجھی۔ نمبر دار کو باہر بھیجا اور
 مثنو کو بلایا۔ میرے ذہن میں یہ بات اٹک گئی تھی کہ ممتاز کی ماں نے
 کہا تھا کہ منور کی ذات اُن سے چھوٹی تھی۔ اس عورت نے ایسا کیوں
 کہا تھا؟

مثنو اندر آئی تو اُس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ میں نے اُسے
 کہا کہ وہ مجھے جو کچھ بھی بتائے گی وہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا اور اُسے
 انعام بھی دلاؤں گا۔ ایسی عورتیں گھبراہٹ کی دراصل ایکٹنگ کیا کرتی ہیں
 ان کی چالاکी تک کوئی عام آدمی نہیں پہنچ سکتا۔ ایسی عورتوں کے متعلق
 میں کئی کہانیاں میں بہت کچھ بتا چکا ہوں۔ مزید کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔
 اُس کی باتوں سے پتہ چلا کہ نمبر دار کی خاص عورت ہے۔ مثنو کی عمر چالیس
 سال سے کچھ کم تھی۔ صاف سُھرے رنگ کی اور بڑے اچھے چہرے نہرے
 والی عورت تھی۔ قد اور جسم بھی دل کو اچھا لگتا تھا۔

”تم کچھ بتا سکتی ہو کہ ممتاز کس کے ساتھ گئی ہے؟“ میں نے
 پوچھا۔ ”اُس کا دوستانہ منور کے ساتھ تھا۔“

”منور کے سوا اُس کا دوستانہ کسی اور کے ساتھ نہیں تھا۔“
 مثنو نے جواب دیا۔ ”منور نے اُسے گھر سے نہیں نکالا۔ وہ بڑی اچھی
 سوچ سمجھ والا آدمی ہے۔ ممتاز چال چلن کی خراب نہیں تھی۔“

”منور کے ساتھ اُس کی ملاقاتیں ہوتی ہوں گی۔“
 ”کبھی کبھی۔“ مثنو نے کہا۔ ”لیکن اچھوں کی طرح نہیں کبھی
 کھیتوں میں دوچار منٹ کے لئے اکٹھے کھڑے ہو جاتے تھے۔ ممتاز منور

کے گھر جایا کرتی تھی اور کبھی کبھی وہاں تھوڑی دیر کے لئے ان کی ملاقات ہو جاتی تھی۔ ان کی باقی ملاقاتیں میری زبانی ہوتی تھیں۔

”ایک دوسرے کو کیا پیغام بھیجتے تھے؟“

”سلام دعا“۔ متو نے جواب دیا۔ ”اور خیریت، یا منور پیغام دیتا تھا کہ فلاں وقت وہ گھر میں اکیلا ہوگا۔ ممتاز کا پیغام یہ ہوتا تھا کہ وہ منگنی کو قبول نہیں کر رہی اور تم بھی کوشش کرو۔ ممتاز کے گلے میں سونے کا بنا ہوا پان کا پتا بندھا رہتا تھا۔ یہ چھوٹا سا تھا اور بڑا خوبصورت تھا۔ یہ اُسے ماں نے ہوا کر دیا تھا۔ ایک روز منور نے یہ پتا ممتاز سے منگوایا تھا۔ میں ہی لاتی تھی منور نے یہ پتا پھر صاحب سے دم کر کے ممتاز کو واپس کر دیا تھا۔ کہتا تھا کہ اس سے اُن کی شادی ہو جائے گی۔“

سونے کا یہ پتا میرے پاس تھا۔ یہ اُس جگہ سے ملا تھا جہاں سے لاش برآمد ہوتی تھی۔ یہ مٹی میں دبایا ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے بعض حضرات سوچتے ہوں کہ لاش کی کچھ چیزیں بعد میں ملی تھیں۔ مثلاً شفاعت کو ایک مڑکی ملی تھی، مجھے یہ پتا مل گیا ہے۔ یہ چیزیں اُس وقت کیوں نہ ملیں جب لاش برآمد ہوتی تھی؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ لاش نیز بارش نے منگنی کی تھی اور اسے گیدڑ، بھیڑیتے اور دن کو گدھ گھسٹتے اور کھاتے رہے تھے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی چیزیں گیلی مٹی میں دب گئیں۔ لاش اٹھانے والوں پر لاش کی حالت نے خوف طاری کر دیا ہوگا جو عموماً ہوتا ہے۔ اکثر لوگ لاش کی کوئی چیز ڈھونڈنے کو لاش کی چوری سمجھتے ہیں اس لئے کسی نے مٹی کی تلاشی لینے کی جرأت ہی نہیں کی۔

میں نے سونے کا یہ پتا منور کو دکھا کر پوچھا کہ یہی تھا؟ متو کے چہرے پر حیرت آگئی اور اُس نے آہستہ آہستہ ہاتھ آگے بڑھا کر میرے ہاتھ سے پتا لے لیا۔ اسے بڑی غور سے دیکھا پھر میرے مُنہ کی طرف دیکھا۔

”یہ آپ کے پاس کس طرح آیا ہے؟“۔ متو نے پوچھا۔

”تمہیں یقین ہے کہ یہ ممتاز کا ہے؟“
”سوال آنے یقین ہے جی؟“۔ متو نے کہا۔ ”اُس کی ماں نے خاص طور پر ستار سے بنوایا تھا اور رنگ ممتاز نے اپنی پسند کے لگواتے تھے۔۔۔ آپ کو کیسے ملا؟“

”اُس کی لاش سے؟“

”لاش سے؟“۔ ممتاز بدک کر آگے ہو گئی۔ ”کس کی لاش سے؟“

”ممتاز زندہ نہیں۔“ میں نے کہا۔

”متو میرے مُنہ کی طرف دیکھتی رہی اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔“

”میں چوری چھپے کی ملاقاتیں کرتی رہتی ہوں۔“ متو نے کہا۔ ”وہ گندی ملاقاتیں ہوتی ہیں لیکن ممتاز اور منور کی محبت گندی نہیں تھی۔ قسم ہے مجھے روزی دینے والے کی، اس لڑکی کے ساتھ مجھے ماؤں والا پیار تھا۔۔۔ لاش کہاں سے ملی تھی؟ لاش گاؤں میں کیوں نہیں آتی؟“

”لاش کو کوئی پہچان نہیں سکا۔“ میں نے اُسے اس سے زیادہ کچھ نہ بتایا اور پوچھا۔ ”ممتاز اتنے دنوں سے غائب ہے۔ تم نے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کہاں چلی گئی ہے؟ متو نے تم سے اُس کی خیر خیریت پوچھی ہوگی۔“

”میں نے تین مرتبہ اُس کی ماں سے پوچھا تھا۔“ متو نے کہا۔ ”تینوں بار ماں نے کہا کہ اُس کا سر دکھ رہا ہے، اندر سوئی ہوئی ہے۔۔۔ منور کو میں یہی بتاتی رہی۔ تیسری مرتبہ منور کو بتایا کہ ممتاز کا سر دکھ رہا ہے اور وہ مجھے نہیں مل سکی تو منور نے کہا کہ اُس کی ماں کہو اس کرتی ہے۔ ممتاز کو اُس نے اور بھائیوں نے قید کر لیا ہے۔ اب اُسے زبردستی ڈولی میں بٹھا کر گھر سے نکالیں گے۔“

”ماں پریشان نظر نہیں آتی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”متو سوچ میں پڑ گئی پھر بولی۔“ ماں، پریشان تو نظر آتی تھی۔
میں سمجھتی تھی شاید اُسے میرا اُس کے گھر میں آنا پسند نہیں تھا۔

چوبیس سال کا لڑکا چالیس سالہ عورت

”متو کی ذات ممتاز کی ذات سے نہیں ملتی تھی؟“

”کیوں نہیں ملتی تھی؟“ متو نے جواب دیا۔ ”ایک ہی ذات ہے۔“ متو چپ ہو گئی اور اُس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آگئی جو کچھ اور ہی قسم کی تھی۔ اُس نے دو چار سینکڑے منہ کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔ ”آپ اگر یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ممتاز کا رشتہ متو کو کیوں نہ دیا گیا تو اس کا جواب میرے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔۔۔ ممتاز کی ماں نے متو کو اپنا درد پردہ خاوند بنا رکھا ہے۔“

مجھے یوں لگا جیسے متو نے میرے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔ متاںیدار کسی بھی بات پر اس طرح نہیں چونکا کرتے۔ متاںیداروں کے سامنے ایسے ایسے واقعات اور ایسی ایسی وارداتیں آتی ہیں جنہیں پولیس کے سوا کوئی بھی سچ نہیں مان سکتا۔ میں نے اپنی آنکھوں ناقابل یقین واقعات دیکھے ہیں لیکن متو نے جو انکشاف کیا اس نے مجھے ہلا کے رکھ دیا۔

”متو!“ میں نے کہا۔ ”اگر تمہارے دل میں ممتاز کی ماں کے خلاف کوئی دشمنی ہے تو وہ کسی اور طریقے سے پوری کرو۔ مجھے وہ باتیں بتاؤ جو بالکل سچی ہوں۔“

”جی میں سچ بول رہی ہوں۔“ اُس نے کہا۔ ”یہ راز کسی اور کو معلوم نہیں۔ مجھے اس طرح معلوم ہوا کہ ممتاز کی ماں کا یہ سلسلہ میرے بغیر نہیں چل سکتا تھا۔“

”اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ متو بد معاش آدمی ہے۔“

میں نے کہا۔

”میں غریب آپ کی بات کو کیسے رد کر سکتی ہوں۔“ متو نے کہا۔
”مجھ سے پوچھیں تو میں کہوں گی کہ متو بچہ بھی بد معاش نہیں۔ وہ اور کوئی بد معاشی نہیں کرتا۔۔۔ میں آپ کو ایک اور بات بتاتی ہوں۔ متو نے ممتاز کی ماں سے ملنے کی کبھی بھی خواہش ظاہر نہیں کی۔ متو پر ممتاز کی ماں کا حکم چلتا ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ ممتاز کی ماں نے متو کو کسی جگہ پہنچنے کے لئے مجھے پیغام دیا۔ میں متو کے پاس گئی تو متو نے کہا کہ اُسے کہنا کہ متو نہیں ملا۔“

مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ ممتاز کی ماں اور متو کہاں اور کس طرح ملتے ہیں نہ ہی یہ میرے لئے کوئی عجوبہ تھا کہ تیس چوبیس سال کے نوجوان کے تعلقات چالیس سال کی عورت کے ساتھ تھے۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ ممتاز کو قتل کس نے کیا ہے۔ کیا ایسا ہوا ہو گا کہ ممتاز کو اپنی ماں کی کرٹ کا علم ہو گیا اور ممتاز نے ماں کا راز فاش کرنے کی دھمکی دی اور ماں نے ممتاز کو قتل کر دیا؟

”یہ وجہ بھی کہ ماں نے ممتاز کا رشتہ متو کو نہیں دیا تھا۔“ متو نے کہا۔ ”ممتاز کے بھائی اتنے منہ زور اور لٹھ باز ہیں کہ متو کو وہ اس بات پر اوندھا کر دیتے کہ اُن کی بہن اُس کی خاطر کسی دوسرے آدمی کی بیوی بننا ہی نہیں چاہتی لیکن ممتاز کی ماں نے اپنے بیٹوں کے دماغ میں ڈال رکھا تھا کہ متو نیک لڑکا ہے۔“

”کیا یہ صحیح ہے کہ متو نے ممتاز سے کہہ دیا تھا کہ وہ اُسے دل سے اُتار دے؟“

”متو کا یہ پیغام میں ممتاز کے پاس لے گئی تھی۔“ متو نے جواب دیا۔ ”ممتاز بہت روتی تھی۔ اُس نے مجھے کہا تھا کہ متو سے کہنا کہ ایک بار ملو لیکن متو نے ملنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔“

متو کے ساتھ میری بہت باتیں ہوتیں۔ باتوں باتوں میں اُس نے

بتایا کہ ممتاز نے اُسے دوبارہ کہا تھا کہ اُس کی زندگی کے دل بہت تھوڑے
رہ گئے ہیں۔ بھائیوں نے اُسے کہا تھا کہ وہ اپنا دماغ درست کر لے،
نہیں تو اُن کے ہاتھوں ماری جاتے گی۔ بڑے بھائی کے ساتھ تو اُس
کی بول چال بھی بند تھی۔

میں نے متو سے کہا کہ وہ کسی کو پتہ نہ چلنے دے کہ میرے ساتھ اُس
کی کیا باتیں ہوتی ہیں۔ متو کو باہر نکال کر نمبر دار کو بلایا اور اُسے کچھ باتیں
بتائیں۔ اُسے میں نے مجبوری کی ڈیوٹی دی تھی۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ
کل صبح متو کو تھانے لے آنا لیکن اُسے اس کیس کے متعلق کچھ نہ بتانا۔ پھر
میں نے متو اور نمبر دار کو جانے کی اجازت دے دی۔

تھانے کے کاموں میں مگن ہو جاؤ تو دن اور رات گزرتے دیر نہیں
لگتی۔ اگلا دن طلوع ہوا تو نمبر دار کے ساتھ متو آگیا۔ مجھے پہلے معلوم ہو
چکا تھا کہ اُسے زہر پہلے محلول سے لکھا ہوا تعویذ پانی میں گھول کر پلایا
گیا ہے۔ شفاعت کی جڑی بوٹیوں سے زہر کا اثر ختم ہو گیا تھا لیکن
اُس کے چہرے پر کمزوری کے اثرات صاف نظر آتے تھے۔ چہرے پر
پھیلا ہوا تھی۔ اس کے باوجود وہ خوبصورت جوان لگتا تھا۔ اس کی خوبصورتی
میں مردانگی تھی یعنی اُس کا سن مردانہ تھا۔ وہ ابھی گھوڑی پر آیا تھا۔

میں نے اُسے اپنے پاس بٹھالیا اور پوچھا کہ وہ اگر زیادہ کمزوری
اور ٹھنک محسوس کر رہا ہو تو اُسے چار پانی پر لٹا دوں۔ میں نے اُسے یہ
بھی کہا کہ مجھے وہ تھانہ دار نہ سمجھے۔ اُس نے کہا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔
”ممتاز کے متعلق کچھ پتہ چلا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کل شام پتہ چلا ہے کہ ممتاز کی لاش ملی ہے۔“ متو نے جواب
دیا۔ ”میں اُن کے گھر گیا تھا۔ وہاں باقاعدہ ماتم ہو رہا تھا۔۔۔ سنا ہے لاش
دور سے ملی ہے۔“

”سنا ہے ممتاز تمہیں چاہتی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”اور وہ منگنی
تمہاری خاطر ترشوانا چاہتی تھی۔“

”آپ نے ٹھیک سنا ہے۔“ اُس نے کہا۔

”تمہارے ماں باپ نے ممتاز کا رشتہ مانگا تھا؟“

”ماں تو میری ہے ہی نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میرے

باپ کو ایک اور گھر پسند تھا۔ میری دوبری بہنیں ہیں۔ دونوں شادی شدہ
ہیں۔ انہوں نے ممتاز کی ماں سے رشتہ مانگا تھا لیکن اُس نے نہ
کر دی تھی۔“

”ممتاز کی ماں تمہیں پسند نہیں کرتی تھی؟“

”پسند نہ کرتی تھی لیکن۔۔۔۔“ وہ چپ ہو گیا اور اُس نے

سر جھکا لیا۔

”متو!“ میں نے اُسے کہا۔ ”اصل وجہ بتا دو۔ مجھے معلوم ہے

وہ تمہیں رشتہ کیوں نہیں دے رہی تھی۔ ممتاز کی ماں کے ساتھ تمہارا جو
تعلق تھا وہ قانون کی نظر میں جرم نہیں۔ اگر یہ جرم ہے تو میں تمہیں گرفتار
نہیں کروں گا۔ میں تو یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ممتاز کس طرح مری ہے
اور اُس کی لاش اتنی دور کس طرح پہنچی ہے۔“

اُس نے وہی بیان دیا جو میں آپ کو دوسروں کی زبانی سنا چکا
ہوں۔ اُس نے کچھ بھی نہ چھپایا۔

”ممتاز کے بھائیوں نے تم سے پوچھا تھا یا تمہیں بتایا تھا کہ ممتاز
کیسں چلی گئی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہ جی!“ متو نے جواب دیا۔ ”ممتاز کی ماں نے مجھے بعد

میں بتایا تھا۔ اس سے پہلے مجھے متو نے بتایا تھا کہ ممتاز کیسں نظر نہیں
آتی اور اُس کی ماں کہتی ہے کہ اُس کا سر دکھ رہا ہے اور وہ اندر سوئی
ہوتی ہے۔“

”تمہیں کوئی شک نہیں ہوا تھا؟“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ میں اُس کے چہرے سے جان گیا کہ وہ کچھ
کہنا چاہتا ہے لیکن ڈرتا ہے۔ میں نے اُس کی حوصلہ افزائی کی تو اُس

نے بات کی۔

پاک محبت تھی

”میں ایک بات کہنا نہیں چاہتا تھا“۔ منور نے کہا۔ ”لیکن ممتاز یاد آتی ہے تو میری حالت بہت بُری ہو جاتی ہے۔ میں کوئی گواہ اور کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتا، صاف بات یہ ہے کہ ممتاز کو اُس کے بھائیوں نے قتل کیا ہے۔“

”تمہیں یہ شک کس طرح ہوا ہے؟“

”میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں نے ممتاز کو جواب دے دیا تھا۔“ منور نے جواب دیا۔ ”اُس نے کہا تھا کہ ایک بار ملو۔ میں ممتاز کے بھائیوں سے نہیں ڈرتا تھا۔ مجھے اچانک ایک تکلیف ہو گئی تھی۔ میں تو مرتے مرتے بچا ہوں۔ میرا دوست علی رضا مجھے ایک ساڈھو کے پاس لے گیا تھا۔ ساڈھو نے مجھے کہا تھا کہ جس لڑکی کو تم نے دل میں بٹھا رکھا ہے، اُسے دل سے نکال دو ورنہ مارے جاؤ گے کیونکہ اُس کا اور بہتا رستارہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ ساڈھو نے مجھے ایک دوائی دی تھی اور کاغذ پر تعویذ کی طرح کچھ لکھ کر بھی دیا تھا۔ بیماری ایسی تھی جو مجھے اندر سے کھا گئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ممتاز تو مجھے مل نہیں سکتی۔ میں نے اُسے جواب دے دیا۔“

”ایک روز ممتاز کی ماں اور اُس کا باپ کسی گاؤں شادی پر چلے گئے۔ ممتاز میرے گھر آتی۔ گھر میں صرف نوکرانی تھی۔ ممتاز مجھے یہ کہہ کر چلی گئی کہ رات کو وہ باہر آتے گی اور میں بھی آؤں۔ میں اُسے کہہ نہ سکا کہ میں نہیں آؤں گا۔ مجھے جگہ معلوم تھی جہاں اُسے آنا تھا۔ میں وہاں چلا گیا۔ میں اُسے کہنا چاہتا تھا کہ ہم اپنی اپنی قسمت کو قبول کر لیتے ہیں۔“

”ممتاز گئی۔ وہ روتی زیادہ اور بولی بہت کم۔ اُس نے بتایا کہ وہ ایک سہیلی کے گھر جانے کا بہانہ کر کے آتی ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ

بڑے بھائی کے ساتھ اُس کی بولی چال بند ہے۔ آج جب اُس کے ماں باپ شادی پر چلے گئے تو بڑے بھائی نے ممتاز سے کہا کہ وہ باز آجائے، نہیں تو مرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ ممتاز نے اُسے کہا کہ تم میرے خدا نہیں ہو، میں تمہارا حکم نہیں مانوں گی۔“

”شام کے بعد وہ اپنے بھائی کو یہ کہہ کر گھر سے نکل آتی کہ فلاں سہیلی کے گھر جا رہی ہے۔ اُس نے بھائی سے اجازت نہ لی۔ اُس نے چھ سات روز پہلے مجھے کہا تھا۔“ میرا دل کہتا ہے کہ میری زندگی ختم ہو گئی ہے۔ اب آخری ملاقات میں اُس نے کہا۔ ”میں بھائی کو لٹاکر آتی ہوں۔ تم میرے بھائیوں کو جانتے ہو۔ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ میں سہیلی کے گھر نہیں گئی تھی تو مجھے تم مجھے زندہ نہیں دیکھو گے۔ اگر میری لاش گاؤں سے باہر کہیں پڑی ہو تو ملی تو سب کو بتا دینا کہ اسے اس کے بھائیوں نے قتل کیا ہے۔“

”پھر اُس نے دوسری باتیں شروع کر دیں۔ وہ مجھے بار بار کہتی تھی کہ میں کسی پیر یا کسی عامل یا پنچ والے کسی بزرگ کے پاس جاؤں اور کوئی ایسا تعویذ لاؤں جس کے اثر سے میری منگنی ٹوٹ جائے اور میرا رشتہ منہیں مل جاتے۔“ اُس نے میری بیماری دیکھی تھی۔ وہ مجھے دیکھنے اپنی ماں کے ساتھ آتی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ اب وہ مجھے آخری بار ملنے آتی تو پھر اُس نے یہی بات کہی کہ میں کسی بزرگ سے کوئی عمل کراؤں۔ میں نے اپنے پیر صاحب سے اُسے ایک چیز دم کرا کے دی تھی۔“

”یہ تھی وہ چیز؟“ میں نے سونے کا بنا ہوا پان کا چھوٹا سا پتا

اُسے دکھا کر پوچھا۔

”بالکل بری۔“ اُس نے یہ پتا ماتھ میں لے کر کہا۔ ”یہ آپ کو اُس کی لاش سے ملا ہو گا۔“ اب آخری بار میں نے اُسے بتایا کہ میں ایک ساڈھو کے پاس گیا تھا جو انا مل بھی کرتا ہے اور غیب کے بھید بتا دیتا ہے۔ اُس

ذہن پر نقش ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے وہ میرے سامنے بیٹھ اب بھی بول رہے ہیں۔ منور ان میں سے ایک ہے۔ ایسے پتہ چلتا ہے جیسے وہ آج بھی مجھے یہ بیان دے رہا ہے۔ مجھے یوں بھی محسوس ہو رہا ہے جیسے آج میرا قلم نہیں منور کی زبان چل رہی ہے اور میں کچھ نہیں رہا بلکہ سُن رہا ہوں۔ میں اُس کا بیان صاف اُردو میں سُن رہا ہوں۔ وہ اپنی دیہاتی پنجابی میں بول رہا تھا۔ اُس کے الفاظ میں سادگی اور جذبات کی چاشنی تھی۔ شفاعت نے اُسے ممتاز سے الگ کر لے کے لئے کہا تھا کہ وہ اُس لڑکی کو دل سے اُتار دے جسے اُس نے دل میں بٹھا رکھا ہے کیونکہ اُن کے ستارے نہیں ملتے۔ منور نے اسے سچ مان لیا تھا مگر ممتاز کی محبت کو وہ دل سے نہیں نکال سکا تھا۔ اگر ممتاز کے ساتھ اُس کے تعلقات ناجائز ہوتے تو وہ جذباتی نہ ہوتا۔ وہ کہتا م نہیں اور سہی۔ اُن کی محبت پاک تھی، اسی لئے آخری ملاقات کو یاد کر کے اُس کے آنسو نکل آتے تھے۔ میں نے اُس کے ساتھ اپنا رویہ اس طرح کر لیا تھا جیسے میں اُس کا ہم جولی اور ہمزاز ہوں۔ مجھے یہ بھی نظر آنے لگا تھا کہ اس آدمی سے مجھے کوئی ایسا اشارہ مل جائے گا جو مجھے ممتاز کی موت کا راز بتا دے گا۔

میں نے اُسے جواب دے دیا

ممتاز کے ساتھ آخری ملاقات کی رویت یاد دہانتے ہوئے منور نے کہا۔ ”میں نے اُسے اپنے ساتھ تو لگا لیا لیکن میں اُسے کہہ رہا تھا کہ وہ چلی جاتے۔ اُس کے ساتھ اتنی لمبی ملاقات کبھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ پاک اور صاف چال چلن کی لڑکی تھی، وہ اس قسم کی ملاقاتوں کو پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ چلی گئی۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ وہ جب دُور چلی گئی تو میں اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ میں قرعہ جی راستے کی بجائے ذرا لمبے راستے سے گیا۔ یہ راستہ ممتاز کے گھر کے قریب سے گزرتا تھا۔ چاندنی چھبکی سی تھی

نے مجھے بتایا کہ مجھ پر یہ بیماری اس لئے آتی ہے کہ میں نے ایک ایسی لڑکی کو دل میں بٹھالیا ہے جس کا ستارہ میرے ستارے کا دشمن ہے۔ اُس نے مجھے کہا کہ اس لڑکی کو جواب دے دو تو فوراً ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں نے دل میں کہا کہ میرا ممتاز کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ سا دھو نے مجھے ایک تعویذ دیا اور کچھ کھانے کو بھی دیا۔ اب دیکھ لو، میں اپنے پاؤں پر یہاں تک آ گیا ہوں اور میرے اندر کی جلن بالکل ختم ہو گئی ہے

”وہ بہت بروقی۔ مجھے بہت انوس ہو رہا تھا لیکن میرے دل میں سا دھو نے بھی ڈر پیدا کر دیا تھا۔ میں نے ممتاز سے کہا کہ وہ چلی جاتے۔ اُس نے میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں ختم کر اپنے قریب کر لیا اور سبک کر بولی۔ ”میرا دل کہہ رہا ہے کہ آج کے بعد میں نہیں نہیں دیکھ سکوں گی، میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں کہ میں بالکل یہی الفاظ اُسے کہنے لگا تھا کہ آج رات ہم دونوں میں سے کسی ایک کی آخری رات ہے

”میں ڈرنے والا شخص نہیں ہوں جناب! لیکن میرے دل پر خوف بیٹھ گیا تھا۔ میں نے ممتاز کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ اُس وقت میرا دل بالکل پاک تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے یہ لڑکی معصوم سی بچی ہے اور ماں باپ سے بچھڑ کر اکیلی روتی پھر رہی ہے۔ اگر مجھے ذرا سا بھی اشارہ مل جاتا تو خدا کی قسم، میں ممتاز کو اپنے گھر لے جاتا اور اپنے باپ کی دونالی بندوق بھر کر باہر کھڑا ہو جاتا اور ممتاز کے بھائیوں کو لگا کر کہتا کہ آؤ، بہت ہے تو اپنی بہن کو لے جاؤ۔“

منور کو چپکی آگئی اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں نے اپنی بعض کہانیوں میں آپ کو بتایا ہے کہ میری ڈائری میں وارداتوں اور تفتیشوں کے اشارے اور تاثرات نہیں لکھی ہیں۔ ان سے مجھے وہ سارا کیس یاد آ جاتا ہے جو میں کھنا چاہتا ہوں۔ بعض طعموں، مشتبہوں اور گواہوں کے چہرے اور الفاظ مجھے ذہن پر زور دے کر یاد کرنے پڑتے ہیں لیکن کچھ انسان ایسے ہیں کہ آج تک اُن کے چہرے اور الفاظ میرے

”میں ممتاز کے گھر کے قریب گلی کا موڑ مڑا تو میں رُک گیا۔ مجھے ممتاز نظر آگئی تھی۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ اُس کے سامنے اُس کا بھائی کھڑا تھا۔ میں نے ٹھوکر کی اوٹ سے دیکھا۔ ممتاز کا چھوٹا بھائی بھی باہر آگیا۔ اُن کی ماں اور باپ دوسرے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ بھائی بڑی دھیمی آواز میں بول رہے تھے۔ ممتاز کی آواز اُن سے اونچی ہو گئی۔ اُس نے کہا۔ ”میں نے کہا ہے کہ دل گھبرا رہا تھا اس لئے میں اکیلی کھیتوں کی طرف نکل گئی تھی۔ میں اکیلی تھی۔“ بھائیوں نے معلوم نہیں اُسے کیا کہا تو وہ بولی۔ ”ہاں، مار دو۔ میں تو مر رہی جا ناچا ہستی ہوں۔ مجھے زندہ رہنے دو گے تو گھر سے چلی جاؤں گی۔“

”دونوں بھائیوں نے اُسے پکڑ لیا اور اندر لے گئے۔ میں وہاں سے چل پڑا۔ میری حالت بہت بُری تھی۔ غصہ بے قابو ہو رہا تھا۔ برادری کا معاملہ تھا اور نہ میں ممتاز کے ساتھ یہ سلوک نہ ہونے دیتا۔ میں آپ کو یہ بات نہیں بتانا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ بھائیوں نے اگر اپنی بہن کو قتل کر دیا ہے تو اچھا کیا ہے۔ اُن کی جگہ میں ہوتا تو شاید میں بھی ایسے ہی کرتا۔ اتنے اونچے خاندان کی لڑکی کہہ دے کہ جس کے ساتھ اُس کی منگنی کی گئی ہے اُسے وہ قبول ہی نہیں کرتی تو آپ سوچیں کہ دوسری ذاتوں، کھین ذاتوں اور ہندوؤں اور سکھوں کے سامنے خاندان کی عزت کیا رہ جاتی ہے، لیکن ممتاز کی باتیں سناتے سناتے میرے دل کا حال کچھ اور ہو گیا ہے، مجھے اپنی زبان پر قابو نہیں رہا۔“

”میں نے پہلے آپ کو ایک دو باتیں صحیح نہیں بتائیں۔ آپ نے پوچھا تھا کہ ممتاز کے بھائیوں اور اُس کی ماں نے مجھ سے ممتاز کے متعلق پوچھا تھا، میں نے آپ کو جواب دیا تھا کہ انہوں نے مجھ سے نہیں پوچھا تھا۔۔۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا۔ آخری ملاقات کے اگلے روز ممتاز کا بڑا بھائی میرے گھر آیا اور اُس نے مجھ سے پوچھا۔ ممتاز یہاں تو نہیں آتی؟“ میں نے کہا۔ ”یہاں اُس کا کیا کام ہے۔ یہاں نہیں

آتی کیوں؟ کیا بات ہے؟“ اُس نے کہا۔ ”کچھ سمجھ نہیں آتی منظور! وہ تورات سے غائب ہے۔“

”مجھے رات کی بات یاد آگئی اور ممتاز کی باتیں جو اُس نے بھائیوں سے کہی تھیں، یاد آئیں۔ بھائی اُسے پکڑ کر لے گئے تھے۔ ممتاز کا بڑا بھائی فیروز تو خدا کو بھی پتے نہیں باندھتا۔ اب وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ ممتاز یہاں تو نہیں آتی؟ میں بھی اسی برادری کا جوان ہوں۔ مجھے طیش آگئی۔ میں نے فیروز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”مجھ سے پوچھتے ہو فیروز! میں دراصل اُسے کہنا چاہتا تھا کہ ممتاز تمہارے سلوک سے بھاگی ہے۔ بھائیوں نے رات کو اُسے مار بیٹھا ہو گا۔ فیروز بڑا دلیر آدمی ہے لیکن اُس کی نظریں جھک گئیں جیسے میں نے اُس کی چوری پکڑ لی ہو۔ وہ کھینہ سا ہو کر چلا گیا۔“

”شام کو اُس کی ماں آگئی۔ اُس نے بتایا کہ اُن کی غیر حاضری میں ممتاز کہیں چلی گئی ہے۔ میں نے کہا کہ اپنے بیٹوں سے پوچھو۔ تھانے جاؤ۔ اُس نے کہا۔ ”وہ کہتے ہیں تھانے نہیں جاتیں گے۔“ معلوم نہیں جناب! میرے منہ سے یہ الفاظ کیوں نکل گئے۔ ”ممتاز نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ اُس کا خدا تمہارے بیٹوں کو ایک نہ ایک دن تھانے پہنچائے گا۔“ ممتاز کی ماں کو یہ بات بُری لگی۔ میرے دماغ پر معلوم نہیں کیا بھوت سوار تھا میں نے کہا۔ ”تمہارے بیٹوں کے سوا کوئی اور نہیں بتا سکتا کہ تمہاری بیٹی کہاں ہے۔“ اُس نے معلوم نہیں کیا کہا۔ میں نے کہا۔ ”میرا تیرا تعلق ختم ہے۔ آج کے بعد میرے گھر میں قدم نہ رکھنا۔“

”وہ چلی گئی۔ میں نے دو تین بار متو کو ممتاز کے گھر بھیجا کہ ویسے ہی وہاں جاتے اور دیکھ کہ ممتاز گھر ہے یا نہیں۔ ممتاز گھر نہیں تھی۔ ماں نے جھوٹ بولا تھا کہ ممتاز کا سر دکھ رہا ہے اور وہ اندر سوئی ہوئی ہے۔۔۔ میں نے پہلے آپ کو باتیں ذرا بدل کر سنائی تھیں۔ اب جو کہہ رہا ہوں یہ بالکل سچ ہے۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ممتاز نے خودکشی کی ہو۔“ میں نے کہا۔
 ”اس کا کوئی ثبوت ہے کہ اُس نے خودکشی کی ہے نہ اس کا کوئی ثبوت ہے کہ اُسے بھائیوں نے قتل کیا ہے۔“ منور نے کہا۔
 ”میں نے آپ کو بتایا ہے کہ ممتاز کے لاپتہ ہونے سے پہلے کیا ہوا تھا۔“
 منور کے ساتھ تو بڑی ہی لمبی باتیں ہوتی تھیں۔ میں اُس کے ایک ایک لفظ پر غور کر رہا تھا۔ شک مجھے بھی تھا کہ ممتاز کے قاتل اُس کے بھائی ہیں لیکن میں انہیں گرفتار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اُن کے خلاف کوئی شہادت نہیں تھی ثبوت کوئی نہیں تھا اور اگر میں انہیں مار پیٹ کر اقبال جرم کر لیتا تو صرف اقبال جرم پر انہیں سزا نہیں دلائی جاسکتی تھی۔ اس کے باوجود میں انہیں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے منور کے ساتھ باتیں کرتے کرتے فیصلہ کر لیا کہ ممتاز کے بھائیوں پر براہ راست حملہ نہیں کروں گا بلکہ ذرا لمبا اور گول راستہ اختیار کر دوں گا۔

وہ ماں کی سطح سے گر پڑی

باتوں باتوں میں ممتاز کی ماں کا پھر ذکر آیا تو میں نے منور سے پوچھا کہ یہ عورت کیسی ہے اور اس نے ممتاز کا رشتہ اُسے (منور کو) کیوں نہیں دیا؟
 منور نے آہ بھری پھر سر جھکا لیا۔ مجھے متو نے بتایا تھا کہ ممتاز کی ماں نے منور کے ساتھ ناجائز تعلق قائم کر رکھا ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ منور اپنی زبان سے اس کی تصدیق کرتا ہے یا نہیں۔
 ”کیا یہ بھی مجھے بتانا پڑے گا؟“ اُس نے ہونٹوں پر پھینکی سی مسکراہٹ لاکر کہا۔ ”یہ بھی سن لیں۔۔۔ ممتاز کی اور میری محبت چار سال پُرانی ہے۔ ممتاز کی ماں کو آپ نے شاید دیکھا ہو، بہت خوبصورت عورت ہے۔ ممتاز کی ماں ہونے کی وجہ سے مجھے وہ اور زیادہ خوبصورت

لگتی تھی۔ میں سات آٹھ سال کا تھا جب میری ماں مر گئی تھی۔ میری دونوں بہنیں مجھ سے بڑی ہیں۔ انہوں نے مجھے بہت پیار دیا لیکن ماں کی جگہ بہن پوری نہیں کر سکتی۔۔۔

”دو سال بعد میرے والد صاحب نے دوسری شادی کر لی اور ایک سال بعد اُسے طلاق دے دی۔ یہ عورت مجھے اور میری بہنوں کو پیار دینے کی بجائے ہمارے ساتھ غیروں جیسا سلوک کرتی تھی۔ میرے والد صاحب نے اُسے کہا کہ میں تمہیں اپنی اولاد پر حکم چلانے کے لئے نہیں لایا۔ اُس نے کوئی اٹلی سیدھی بات کہہ دی۔ میرے والد صاحب برداشت کرنے والے آدمی نہیں۔ انہوں نے اُسے طلاق دے دی۔۔۔“
 ”میں ماں کے پیار کو ترس رہا تھا۔ نوجوانی میں میرے اور ممتاز کے دل میں ایک دوسرے کی محبت پیدا ہو گئی تو میں ممتاز کے گھر جانے لگا۔ ممتاز کے بھائیوں کے ساتھ میری دوستی تھی۔ میں ان کے بہانے ممتاز کو دیکھنے جایا کرتا تھا۔ ممتاز کی ماں میرے ساتھ بہت پیار کرتی تھی۔ مجھے اسی پیار کی ضرورت تھی۔ یہ ماں کا پیار تھا جو ممتاز کی محبت سے زیادہ اچھا لگتا تھا۔۔۔

”میں پوری طرح جوان ہو گیا تو بھی ممتاز کی ماں میرے ساتھ پہلے کی طرح پیار کرتی رہی۔ بے شک وہ خوبصورت عورت ہے اور جوان اولاد کی ماں ہوتے ہوئے بھی جوان لگتی ہے لیکن میں اُس کے پیار کو ماں کا پیار سمجھتا تھا۔ ایک روز میں اُن کے گھر گیا تو ممتاز کی ماں اکیلی تھی۔ ممتاز ایک سیلی کے گھر چلی گئی تھی۔ اُس کی ماں مجھے اندر بٹھا کر میرے پاس بیٹھ گئی اور میرے سر کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ ماں کے سینے سے لگے مدت ہو گئی تھی۔ اُس نے مجھ پر نثر طاری کر دیا لیکن وہ ماں کی سطح سے گر پڑی۔ اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں دلوچ لیا اور میرا نیچے والا ہونٹ اپنے ہونٹوں میں لے کر اسے چوسنے لگی، پھر اُس کا ہاتھ میری ران پر چلا گیا۔ میں جوان تھا۔ میری ران پر رکھے ہوئے اُس کے ہاتھ نے

میری جوانی کو بیدار کر دیا۔ وہ لیٹ گئی اور مجھے اپنے اوپر گر لیا۔ میں اسے روک نہ سکا۔ جذبات نے ایسا جادو چلایا کہ ہم ماں بیٹا نہ رہے۔۔۔
 ”کبھی مجھے افسوس ہوتا کبھی خوشی ہوتی، پھر یہی سلسلہ چل پڑا لیکن میں نے ایسی خواہش کبھی نہیں کی تھی۔ وہ مجھے بلاتی تھی۔ کرتے کرتے ممتاز کے رشتے کا وقت آگیا۔ میں نے ممتاز کی ماں سے کہا کہ ممتاز مجھے دے دو۔
 اس نے کہا کہ ممتاز کے ساتھ میرا نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ میں نہیں مان رہا تھا۔ میں نے کہا کہ کسی کو ہمارے اس تعلق کا علم نہیں، نکاح میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ اس نے کہا۔ ”میں دیکھ نہیں سکوں گی کہ تم کہیں دوسری عورت نے قبضہ کر لیا ہے، خواہ وہ میری اپنی بیٹی ہو۔۔۔“

”مجھے اس عورت سے نفرت ہو لے گی۔ میں لے اسے کہا کہ میرے سامنے نہ آیا کرو لیکن وہ مجھ پر جادو کی طرح سوار ہو گئی تھی۔ میں اس سے نجات حاصل نہ کر سکا۔ اس سے مجھے صرف یہ فائدہ ہوا کہ اس عورت نے اپنے بیٹوں پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں ممتاز کو چاہتا ہوں۔ انہیں بہت بعد میں میری اور ممتاز کی محبت کا علم ہوا تھا لیکن ماں نے انہیں بتایا تھا کہ منظور بڑا شریف آدمی ہے، یہ ممتاز ہے جو منظور کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔“

”کیا تم نے محسوس کیا تھا کہ ممتاز کی ماں کے دل میں ممتاز کی رقابت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”محسوس کیا کیا؟“ منظور نے کہا۔ ”وہ تو صاف کہتی تھی کہ یہ اس کی برداشت سے باہر ہے کہ میرے دل میں کسی اور کی محبت ہو، خواہ اس کی بیٹی ہی ہو۔“

”اس عورت نے کسی اور کو بھی درپردہ دوست بنا رکھا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”نہیں۔“ منظور نے کہا۔ ”یہ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایسی عورت نہیں۔ دراصل اس کا خاوند بڑا ڈھیلا اور مردہ سا

آدمی ہے، فغول باتیں کر کے ہر کسی پر اپنا رعب جانے کی کوشش کرتا ہے۔ ممتاز کی ماں نے مجھے بتایا تھا کہ اس شخص کے پاس کھوکھلے رعب کے سوا کچھ بھی نہیں۔“

”کیا یہ شک کیا جاسکتا ہے کہ ممتاز اگر قتل ہوتی ہے تو اس میں اس کی ماں بھی شامل ہوگی؟“

”نہیں۔“ منظور نے جواب دیا۔ ”وہ ایسی بد معاش عورت نہیں۔ اگر وہ ایسی ہوتی تو اپنے خاوند کو کبھی کاٹھکانے لگا چکی ہوتی۔ چار پانچ مرتبہ وہ تنہائی میں میرے آگے رو پڑی اور کہنے لگی کہ مجبور ہو کر تمہارے ساتھ یہ کھیل کھیل لیتی ہوں لیکن بعد میں اپنے آپ پر لعنت بھیجتی ہوں، پھر بھی جب دیکھتی ہوں کہ تمہارا دل کسی اور عورت کے ساتھ ہے تو مجھے غمت آجاتا ہے اور دل میں اس کے سوا کچھ نہیں آتا کہ تمہیں اپنے سینے میں ڈال کر چسپاں لوں۔“

تمہانیدار اس طرح بیان نہیں لیا کرتے جس طرح میں لے رہا تھا۔ جذباتی باتوں کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ تو میں نے کہانی پڑھنے والوں کی دلچسپی کے لئے منظور کے بیان کا یہ حصہ بھی لکھ دیا ہے۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ انسانی فطرت جب پیاسی ہوتی ہے تو کس سطح تک پہنچ جاتی ہے۔ منظور کو ممتاز کی ماں جو اچھی لگتی تھی، یہ ایک نفسیاتی معاملہ ہے۔ اسے اس عورت کے پیار میں ماں نظر آتی تھی۔ نفسیات کی رو سے ماں کے پیار کا پیاسا آدمی اگر ناجائز دوستی کا خواہشمند ہوگا تو اپنے سے بڑی عورت کو پسند کرے گا۔

”دیکھو منظور۔“ میں نے اسے کہا۔ ”تم کا دل چلے جاؤ۔ وہاں بہت سے لوگوں کو پتہ چل چکا ہوگا کہ تمہیں تھانے بلایا گیا تھا۔ وہ تم سے پوچھیں گے۔ ممتاز کی ماں اور اس کے بھائی تو ضرور پوچھیں گے۔ انہیں گول مول سا جواب دے دینا میرے تمہارے درمیان جو باتیں ہوتی ہیں، یہ کسی کو نہ بتانا تم عقل والے جوان ہو۔ اپنے طور پر جاسوسی کرنا۔“

کوئی اشارہ مل جائے تو اسی وقت تھانے آجانا۔“

قدرت نے سزا سنادی

منور چلا گیا اور وہ دن گزر گیا

اگلار و زبھی دوسرے کاموں میں گزر گیا۔

شام کو شفاعت کا ایک چیلہ آگیا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ مجھے معلوم ہے کہ یہ شخص شفاعت ہے سادھو نہیں۔ یہ چیلہ شریف آدمی نہیں تھا۔ شفاعت کے گروہ کا آدمی تھا۔ اُس کا حال چلیہ سادھوؤں والا تھا۔ اُس نے سر اُترے سے صاف کر رکھا تھا اور ماتھے پر دو تین رنگوں کی کیریں ڈالی ہوئی تھیں۔ جو گیارہ رنگ کے سادھوؤں جیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ گٹھنوں کے نیچے ٹانگیں ننگی تھیں۔ جوان آدمی تھا۔ ”گورو مہاراج نے بھیجا ہے“ اُس نے کہا۔ ”وہ بہت بُری

تکلیف میں ہیں۔“

”میں گورو مہاراج کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ میں نے کہا۔ ”انہیں اگر کوئی آدمی پریشان کرتے ہیں تو مجھے بتاؤ۔۔۔ کیا تکلیف ہے انہیں؟“

اُس نے وہی تکلیف بتائی جو شفاعت مجھے پہلے بتا چکا تھا لیکن اب اُس کی حالت اور زیادہ بگڑ گئی تھی۔ چیلے کی رپورٹ یہ تھی۔ شام کے بعد اُس کی کیفیت یہ ہو جاتی تھی کہ بیٹھے بیٹھے اُٹھ کھڑا ہوتا، خنجر نکال لیتا اور لٹکا لے لگتا۔ ”آؤ، قریب آؤ میرے۔“ اور وہ ایک جگہ کھڑا ہر طرف دیکھتا اور گھومتا رہتا تھا۔ چیلے اُس سے پوچھتے تھے کہ اُسے کیا نظر آ رہا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ جتن اور چٹیلین ہیں۔ یہ کیفیت زیادہ دیر نہیں رہتی تھی لیکن اگلا دورہ پچھلے دورے سے زیادہ شدید ہوتا تھا۔

دوراتوں سے اُس کی حالت یہ ہو گئی کہ دونوں راتیں وہ دو تین بار اُٹھا اور واہی تباہی بکنا کُف سے باہر دوڑنا نکل گیا۔ چیلے بھی جاگ اُٹھے اور باہر کو دوڑے گئے۔ اپنے گورو مہاراج کو دیکھا۔ وہ ہوا میں ادھر ادھر خنجر مار رہا تھا۔ چیلوں نے اُسے پکڑ لیا اور اندر لے گئے۔

دن کے وقت وہ بالکل ٹھیک رہتا تھا۔ اُس کے پاس ہندو لگتے رہتے تھے۔ عورتیں زیادہ آتی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ چیلہ بہرہ و پیاسے اور پکا بد معاش لیکن میں نے اُسے نہ بتایا۔ اُس کے ساتھ بائیں ہوتی رہیں۔ میں نے اُس سے بہت کچھ پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ علی رضا دو دنوں سے شفاعت کے پاس آ رہا ہے۔ علی رضا کے متعلق آپ کو بتا چکا ہوں کہ وہ نیم پاگل ہو چکا تھا، یا یوں کہہ لیں کہ اُسے پاگل پن کا دورہ دن رات میں تین چار بار پڑتا تھا۔ وہ قہقہے لگاتا تھا یا روتا تھا۔

”علی رضا گورو مہاراج سے کہتا ہے کہ مجھے ٹھیک کر دو۔“ چیلے نے میرے ایک سوال کے جواب میں کہا۔ ”گورو مہاراج نے اُسے کہا ہے کہ میں خود نہ جانے کس مصیبت میں گرفتار ہوں، بہتیں کس طرح ٹھیک کر سکتا ہوں۔ علی رضا کہتا ہے۔“ میری یہ حالت بہت بڑی وجہ سے ہوتی ہے۔ تم ہی میری حالت ٹھیک کر سکتے ہو۔ کل علی رضا پھر آگیا اور گورو مہاراج کے ساتھ اُس نے بڑی ہی بد تمیزی سے بائیں کیں۔ مہاراج کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ چیلوں نے علی رضا کو دھکے دے کر کُف سے نکال دیا۔“

مجھے تو معلوم تھا کہ علی رضا اس حالت کو کس طرح پہنچا تھا اور علی رضا نے شفاعت سے کیا کام کرایا تھا لیکن میں نے انجان بن کر اس چیلے سے پوچھا کہ علی رضا نے گورو مہاراج سے یہ کیوں کہا تھا کہ اُس کی یہ حالت گورو مہاراج کی وجہ سے ہوتی ہے؟

”مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں سرکار۔“ چیلے نے کہا۔

”تمہیں سب کچھ معلوم ہے۔“ میں نے آگے ہو کر اُسے راز داری

سے زیادہ اللہ کی یاد میں محو رہتی ہے۔ مجھے خیال آیا کہ وہ شفاعت اور علی رضا کو ضرور بددعا تیں دیتی ہوگی اور نہ جسے رہزن اور نہ سیر احمد کے لئے اس کے مُنہ سے سوودعا تیں نکلتی ہوں گی۔

شفاعت کا چیلہ جانے لگا تو بُڑک گیا اور میرے مُنہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ڈرتا تھا۔ میں نے اُسے دوستانہ لہجے میں کہا کہ وہ کہہ دے جو کچھ کہنا چاہتا ہے۔

”بات یہ ہے سرکار!۔ اُس نے کہا۔ ”مہاراج اپنے آپ میں نہیں رہے۔ اگر آپ کو سب کچھ معلوم ہے تو میری یہ بات کہہ لیں کہ وہ اپنے آپ کو ختم کر دیں گے یا ختم کر دیتے جائیں گے۔ ایک فوجی جس کا نام زبیر ہے، آج پھر آیا تھا۔ اُس نے مہاراج سے کہا ہے کہ میں نے تمہیں آٹھ دلوں کی مہلت دی ہے۔ گن لو کتنے دن رہ گئے ہیں۔۔۔ مہاراج اندر سے اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ انہوں نے زبیر کے آگے ہاتھ جوڑ کر مہلت کی کہ مجھے بخش دو۔ زبیر نے کہا کہ خدا نے تمہاری سزا سننا دی ہے اور وہ سزا تمہیں میرے ہاتھوں ملے گی۔ یہاں سے چلے جاؤ۔“

میں ایک جراتم پیشہ آدمی کی سیکوریٹی کا انتظام نہیں کر سکتا تھا۔ شفاعت کے چیلے سے میں نے کہا کہ زبیر نے آٹھ دلوں بعد کوئی گڑبڑ کی تو میں سنبھال لوں گا۔ جاؤ مہاراج کو تسلی دو۔

شبائش مہنگی پر گئی

مجھے ”مہاراج“ کا کوئی غم نہیں تھا۔ مجھے اگر غم تھا تو اپنی سروس کا اور اپنی ڈیوٹی کا تھا۔ وہ لاش میرے گے پڑی ہوتی تھی جس کی شناخت نہیں ہو سکی تھی۔ ڈی۔ ایس۔ پی کا ایک روز فون آیا جو اُس نے کسی اور بات کے لئے کیا تھا مگر یہ بات کہ اُس نے پوچھا۔ ”اُس لاش کی تحقیقات کر رہے ہو؟“

کے لہجے میں کہا۔ ”اور مجھے بھی معلوم ہے۔“ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ آگئی اور اُس نے آنکھیں ادھر ادھر پھیرنی شروع کر دیں۔

”مت گھبراؤ۔“ میں نے کہا۔ ”صحیح بات بتاؤ۔ مہاراج نے میرے لئے کیا پیغام بھیجا ہے۔ تھانے کے احاطے سے نکل کر پھر ساڈھو کا چیلہ بن جانا میرے ساتھ سیدھی بات کرو۔“

”سرکار!“ اُس نے پھینکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ ”مہاراج بہت ڈر رہے ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تمہارا حضور سے کہنا کہ مجھے تھانے میں بٹالو، میری جان خطرے میں ہے۔ میرے پاس آؤ اور میری حالت دیکھو۔“

”اپنے مہاراج سے کہنا کہ میں وہ علم نہیں جانتا جو تمہیں اس لئے اثر سے نجات دلا دے۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارا طرز عمل اور مشتبہوں کو تھانے میں بٹالیا کرتے ہیں کسی کو پناہ نہیں دیا کرتے۔“

دراصل شفاعت کا دماغ اُس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ مجھے اپنی حالت بتا گیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اُس پر اُس کا لے جادو کا الٹا اثر ہو گیا ہے جو اُس نے شکوری پر چلایا تھا لیکن میں اسے ضمیر کی سزا کہتا تھا۔ بیشک وہ مجرم فطرت کا آدمی تھا لیکن ضمیر کی خاصیت ہے کہ اپنے اوپر کسی جرم کا بوجھ نہیں لے سکتا۔ اُس سے بڑا گناہ نا جرم سرزد ہو گیا تھا۔ ایک شریف اور پاک لڑکی کو جو موم و صلوة کی پابند تھی، کالے علم کے اثر میں لانا ایسا جرم تھا جسے شفاعت جیسے پختہ کار مجرم کا ضمیر بھی برداشت نہ کر سکا۔

میں شفاعت کے اس رد عمل کی دوسری وجہ بھی بیان کر چکا ہوں۔ یہ میرا ایمان ہے کہ جو طاقت اللہ کے کلام میں ہے، اُس کا مقابلہ کوئی علم اور کوئی جادو نہیں کر سکتا۔ تاہم زبیر احمد نے مجھے بتایا تھا کہ شکوری پہلے

”گھر رہا ہوں“ میں نے کہا اور میرے منہ سے نکل گیا۔ ”قتل کا کیس ہے۔ تفتیش کر رہا ہوں“

اُس نے خوش ہو کر مجھے شاباش دی۔ یہ شاباش مجھے مہنگی پڑ رہی تھی۔

میں نے صبح پہلایہ کام کیا کہ ایک کانٹیل کو ممتاز کے گاؤں بھیجا کہ ممتاز کی ماں کو ساتھ لے آئے۔ اُسی روز نانک زبیر احمد کے گاؤں کا نمبر وار شکر آگیا۔ اُس نے پہلی خبر یہ سنا کہ کل نانک زبیر اور شکوری کی شادی ہو رہی ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ لوگ شکوری کے متعلق کیا باتیں کرتے ہیں۔

”زبیر نے سب کے منہ بند کر دیئے ہیں“ شکر نے کہا۔ ”اب کوئی شکوری کے خلاف بات کرتا ہے تو ادھر ادھر دیکھ کر کرتا ہے کہ زبیر نہ سن لے۔ لوگوں نے تو ایسی ایسی باتیں گھڑی تھیں کہ سننے والے کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔ ایک بات تو ہر کوئی کہتا تھا کہ خود گئی تھی اور پیش موج کر کے واپس آگئی ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ ایک آدمی کے پیچھے نکل گئی تھی کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرے گا لیکن اس آدمی نے اُسے خراب کر کے واپس بھیج دیا ہے۔ نانک زبیر نے ایک دن گاؤں کے سرکردہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو اکٹھا کر لیا اور لگا کر کہا کہ جسے شکوری کے خلاف بات کرنی ہے وہ میرے سامنے کرے۔“

”سب خاموش رہے۔ زبیر نے اُنہیں کہا کہ تھوڑی دیر بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔ وہ چلا گیا اور علی رضا کو پکڑ کر لے آیا۔ علی رضا معمولی آدمی نہیں لیکن زبیر نے اُس کا گریبان پکڑ رکھا تھا اور علی رضا کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ زبیر نے سب سے کہا کہ اس سے پوچھو شکوری کہاں گئی تھی۔ علی رضا کا دماغ صبح نہیں کسی کو معلوم نہیں کہ اسے کیا ہوا تھا۔ وہ تو پاگل ہو گیا ہے۔ زبیر کی بات سن کر علی رضا نے ہتھ پر لگا یا پھر بچوں کی طرح رونے لگا۔ میں بھی وہیں تھا۔ میں نے کہا کہ یہ تو پاگل ہے، اسے

تنگ نہ کرو۔“

”اتنی دیر میں علی رضا کے خاندان کے تین آدمی آگئے۔ اُنہیں کسی نے بتایا تھا کہ زبیر علی رضا کو گریبان سے پکڑ کر کہیں لے گیا ہے۔ وہ تین آدمی لاسٹیاں لے کر آتے تھے۔ زبیر کو ڈنکا پھلا لگتا وہاں سے چلا گیا۔ ہم سمجھے کہ بھاگ گیا ہے لیکن وہ اپنی ایک نالی بندوق اٹھائے آگیا۔ اُس کے گلے میں کارٹوسوں کی بیڑی تھی۔ اُس نے سب کو لاکارا۔ سب جانتے ہیں کہ وہ کیسا آدمی ہے۔ سارے گاؤں میں اُس جیسا اکھڑا درجرات والا آدمی کوئی نہیں۔ وہ معمولی باپ کا بیٹا نہیں۔ اُس کا باپ صوبہ لارپری پنشن پر اکرم تھا۔ انگریزوں نے اُسے بے شمار زمین دی تھی۔ زبیر کے دو چچے بڑے زبردست آدمی ہیں۔ اُن کے بیٹے زبیر کے بازو ہیں۔“

”ادھر زبیر بندوق لے کر نکل آیا ادھر اُس کے چچیرے بھاتی لاسٹیاں اور کھانیاں لے کے آگئے۔ علی رضا کے بھاتی اور دوسرے دو رشتہ دار وہاں سے کھسک گئے۔ زبیر نے لاکار کر کہا۔ ”کسی نے میری منگیتر کا نام بھی لیا تو اُس کی زبان کھینچ لیں گے۔“ وہاں سارے گاؤں کی آبادی اکٹھی ہو گئی تھی، زبیر نے ہمارے سوامی جی (شفاعت) کے خلاف بولنا شروع کر دیا۔ اُس نے ایسے ایسے الفاظ کہے کہ ہندو واکم تو ہو ہی بے غیرت۔ وہ جسے تم گورو، سادھو، ہمارا ج، سوامی اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہو، مسلمان نو سرباز ہے۔ وہ چورا اور ڈاکو ہے۔ وہ رُجھے رہن کا اور بد معاشرلوں کا دوست ہے اور تم اپنی بیٹیوں اور جوان عورتوں کو اُس کے پاس بھیجتے ہو۔“

”میں ڈر گیا کہ اب ہندو مسلم فساد ہوگا کہ ہوا۔ میں نے فوراً ایک آدمی سے کہہ دیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی لڑائی شروع ہوگئی تو تم میری گھوڑی پر فوراً اٹھانے اطلاع کر دینا لیکن ہندوؤں نے عقل سے کام لیا۔ میں نے زبیر کو گلے لگا کر ٹھنڈا کیا اور اُسے اُس کے گھر لے گیا۔ رات کو سرکردہ ہندوؤں

نے مندر میں بیٹھ کر سر جوڑے۔ میں بھی گیا تھا۔ کئی بار ایسے ہوا ہے کہ کسی جگہ کوئی سکھ یا مسلمان سادھوؤں یا یوگیوں کے بہروپ میں پھٹا گیا۔ ہم نے زیر کی بات پر غصہ کرنے کی بجائے اس پر غور کیا کہ کسی طرح معلوم کرو کہ یہ سادھو جسے ہم سوامی کہتے ہیں، کوئی بہروپ یا تو نہیں

”آپ کے تھالے سے خبر اُڑی کہ یہ سادھو مشکوک ہے۔ اگلے روز دو معزز ہندو آپ کے پاس آئے اور آپ سے پوچھا کہ یہ سادھو مشکوک تو نہیں۔ آپ نے انہیں یقین دلایا کہ یہ سادھو صحیح معنوں میں سادھو ہے اور اس نے آپ کو ایسی باتیں بتائی تھیں جو بالکل ٹھیک جیسی تھیں۔“

نمبردار کے ساتھ میری بہت باتیں ہوئیں۔ اُس نے بتایا کہ ہندوؤں کے پنڈت کے شفاعت کی کُف میں جا کر اُس کے ساتھ اپنے مذہب کی باتیں کی تھیں اور شفاعت امتحان میں پورا اُترتا تھا۔ اس سے آپ اندازہ کریں کہ وہ کتنا کامیاب بہروپ یا تھا۔ نمبردار نے زیر کے متعلق یہ راتے دی کہ وہ ہنٹ کا پرکا ہے اور وہ جو کہتا ہے وہ کر کے ہی رہتا ہے۔

مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ مجھ سے کب بھول ہو گئی کہ میں نے زیر کو بتا دیا کہ یہ سادھو جو اتم پشیہ مسلمان ہے۔ میں تو اسے راز رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ ڈر بھی محسوس ہونے لگا کہ زیر احمد اگر ایسا ہی ہے جیسا شک تیار ہے تو وہ کہیں شفاعت کو قتل ہی نہ کر دے۔

نمبردار تھالے میں آتے رہتے تھے۔ یہ اُن کی ڈیوٹی تھی۔ شک کہ بھی ایسے ہی چمکے میں آیا تھا۔ کچھ سرکاری باتیں ہوئیں اور وہ چلا گیا۔

ممتاز کی ماں اور منور

دوپہر کے بعد ممتاز کی ماں آگئی۔ اُس کے ساتھ اُس کا خاوند اور دونوں بیٹے تھے۔ وہ سب میرے پاس آگئے۔ سب سے پہلے ممتاز کے باپ نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے اُنہیں کیوں بلایا ہے۔ اس شخص کے متعلق میں سن

چکا تھا کہ ڈھیلا اور کھوکھلا آدمی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ میں نے انہیں نہیں بلایا۔ میں نے صرف اس عورت کو بلایا ہے جو لاپتہ لڑکی کی ماں ہے۔

”ہم دونوں اس کے بیٹے ہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہے۔“ بڑے بیٹے فیروز نے کہا۔ ”آپ جو کچھ پوچھنا چاہتے ہیں وہ ہم سے پوچھ لیں۔“ ”ہم آپ کو سب کچھ بتا گئے تھے۔“ چھوٹے بیٹے اقبال نے کہا۔

”اب اور کیا پوچھنا ہے آپ کو؟“ ”مجھے جو کچھ پوچھنا ہے وہ میں تمہاری ماں سے پوچھوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اگر تم لوگ اپنی بہن کی کشمکش کی رپورٹ اپنے تھالے میں دے دیتے تو آج اس تھالے کے چکر دل سے محفوظ رہتے۔ مجھے پوری تحقیقات کرنے کا حکم ملا ہے۔ تمہاری بہن قتل ہوئی ہے تم تینوں باہر نکل جاؤ اور اس عورت کو یہیں رہنے دو۔ یہ گاؤں نہیں بچانا ہے۔“

وہ باہر نکل گئے۔ میں نے کانشیل کو بلا کر کہا کہ ان تینوں کو یہاں سے دُور لے جاؤ۔ برآمدے سے بھی باہر لے جاؤ۔ میں آپ کو پہلے ہی بتا دیتا ہوں کہ میں جہانی ایذا رسانی کا قائل نہ تھا۔ میرا طریقہ نفیث کچھ اور تھا۔ ان لوگوں کو میں کسی اور اذیت میں مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس طرح کہ انہیں بار بار تھانے بلانا تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ میں انہیں پہلی ہی بار کہتا کہ تم نے اپنی بہن کو قتل کیا ہے اور وہ یہ کہہ دیتے کہ ہاں ہم نے اپنی بہن کو قتل کیا ہے۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ انہوں نے بہن کو قتل نہ کیا ہو۔ اگر قتل ہی کیا تھا تو یہ ایسا قتل تھا جس میں ملزموں کا کوئی سراغ نہیں ملا کہ تا۔ میرے اس طریقے کی پہلی کڑی یہ تھی کہ ان کی ماں کو بلایا تھا اور وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ میں نے اپنا رویہ اور انداز

تعمید اوروں جیسا کر لیا تھا۔

”بیٹی کا کچھ پتہ چلا؟“ میں نے ممتاز کی ماں سے پوچھا۔

”نہ جی!“ اُس نے منوم سے لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ کہتے ہیں کہ اُس کی لاش ملی ہے۔“
 ”میں کس طرح یقین کر لوں کہ تمہیں معلوم نہ ہو کہ تمہاری بیٹی کس کے ساتھ گئی تھی؟“
 ”مجھے کچھ پتہ نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میں اتنا ہی جانتی تھی کہ وہ متور کو جاہتی ہے۔“
 ”تم نے کہا تھا کہ متور کی ذات تمہاری ذات سے کمتر ہے۔“
 ”میں نے کہا۔“ تم نے یہ جھوٹ کیوں بولا تھا؟“
 ”جھوٹ تو نہیں۔“ اُس نے کہا۔

”کیا متور تمہاری ذات اور تمہاری برادری کا آدمی نہیں؟“ میں نے پوچھا اور اُس کا جواب سُننے بغیر کہا۔ ”تم سمجھتی ہو کہ گاؤں میں اور کوئی انسان نہیں جو مجھے سچ اور جھوٹ الگ کر کے بتا سکے
 تمہارا جھوٹ تمہیں پھنساتے گا۔ اب بولو متور کی ذات کیا ہے؟“
 اُس نے متور کی صبح ذات بتادی۔ میری اُس کی اپنی ذات تھی۔ پھر کہنے لگی۔ ”آپ نے متور کو بلایا تھا۔ معلوم ہوتا ہے وہ آپ کو اٹلی سیدھی باتیں بتا گیا ہے۔ وہ جھوٹا آدمی ہے۔ اُس کی کسی بات کو سچ نہ ماننا۔“
 ”میں اُسے جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ کبھی کبھی تمہارے ساتھ بھی جھوٹ بول دیتا ہے۔ تم اُسے بلاتی ہو اور وہ جواب بھیجتا ہے کہ متور گھر نہیں۔“

اُس نے چونک کر میرے مُنہ کی طرف دیکھا۔ دھچکے جو اُسے لگا تھا، وہ اُس کے چہرے سے ظاہر ہونے لگا۔

”آپ اس طرح سوال کرتے ہیں جیسے اپنی بیٹی کو میں نے خود غائب کیا ہے۔“ اُس نے پریشان سے لہجے میں کہا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کہنے لگی۔ ”میرے غم کو آپ شاید نہیں سمجھ رہے۔“
 ”میری بات کان کھول کر سن لو۔“ میں نے کہا۔ ”تم اُس رات

گھر میں نہیں تھیں جس رات تمہاری بیٹی لاپتہ ہوئی تھی۔ اپنے بیٹوں سے پوچھو۔ وہ جانتے ہیں اُن کی بہن کہاں ہے۔ میں تمہاری عزت کا خیال رکھوں گا۔ تم خود بھی اپنی عزت کا خیال کرو۔ بار بار تھکانے آنا ٹھیک نہیں۔ مجھ سے تم لوگ کوئی بات نہیں چھپا سکتے۔ میں تمہیں بتا دوں کہ جہاں سے لاش ملا کرتی ہے اُس جگہ کی مٹی گواہی دیا کرتی ہے کہ قاتل کون ہے۔ میں تمہیں جانے کی اجازت دے دیتا ہوں۔ اگلی بار بلاؤں گا تو سوچ کر آنا۔ یہاں جھوٹ نہیں چلے گا۔“

میں نے اُسے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ کچھ کہے بغیر باہر چلی گئی۔ اُس کا خاندان اندر آگیا۔ مجھ پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ بڑی اونچی ذات کا آدمی ہے، اُس نے کوئی بات کی۔

”اپنے گھر کی خبر لے چوہری!“ میں نے اُسے کہا۔ ”اپنی چار پائی کے نیچے لٹاٹی پھیر۔ یہ تھکانہ ہے۔“

وہ میرے سامنے کُرسی پر بیٹھ گیا اور مُنہ بیوقوفوں کی طرح کھول کر میرے مُنہ کی طرف دیکھنے لگا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ میری بات نہ سمجھ سکا ہو۔ مجھے اُس پر غصہ آنے لگا تھا۔

”مجھے کچھ پتہ نہیں چل رہا۔“ اُس نے بے بسی کے لہجے میں کہا۔ ”کچھ سمجھ نہیں آرہی۔ بیٹے اپنی ماں کے قابو میں ہیں۔ مجھے کچھ نہیں بتاتے۔ اپنی بیٹی سے مجھے بہت پیار تھا۔“ اُس کی بچی نکل گئی اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کہنے لگا۔ ”میں نے کہا تھا کہ مبتلا کارشتہ متور کو دے دو۔ میرا جھوٹا بیٹا بھی یہی کہتا تھا لیکن میری بیوی نہ مانی۔ متور کو وہ پسند نہیں کرتی تھی۔“

”متور کیسا لڑکا ہے؟“

”بہت اچھا لڑکا ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میرے بیٹوں کی طرح ہر کسی کے گلے نہیں پڑتا۔ بولتا وہاں ہے جہاں بولنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر ایسا بولتا ہے کہ سب کے مُنہ بند کر دیتا ہے۔“

”ایک بات بتا دو ہری؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری بیٹی ممتاز منور کو چاہتی تھی؟“

”اچھی طرح معلوم تھا جی!“

”کبھی تمہارے دل میں شک آیا ہے کہ منور نے ممتاز کو کہیں چھپا رکھا ہے؟“

”نہیں۔“ اُس نے بڑی زور زور سے سر ہلا کر کہا۔ ”منور ایسا لڑکا نہیں۔ میں قسم بھی کھا سکتا ہوں۔“

میں نے اُس سے اور بھی بہت کچھ پوچھا لیکن ایسے لگتا تھا جیسے اپنے گھر کے متعلق اُسے کچھ بھی معلوم نہیں۔ اُسے کہا کہ وہ چلا جاتے۔ وہ باہر نکلا تو اُس کے پیٹے آگئے۔ انہیں میں نے ایسی فنول ہائیں کہیں کہ وہ گھبرا گئے۔ میں نے انہیں چلے جانے کو کہا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ انہیں مسلسل گھبراہٹ اور بے یقینی کی کیفیت میں رکھا جاتے۔

شکوری کی شادی اور رحمار ہزن

اس سے اگلے روز نانک زبیر احمد اور شکوری کی شادی تھی۔ مجھے بالکل یاد نہیں تھا۔ نمبر دا شکر مجھے بتا گیا تھا۔ میرے لئے ان کی شادی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ تھانیدار ایسی غیر ضروری باتیں یاد نہیں رکھ سکتے میرا وہ دن تھانے کی جھک جھک بانگ بانگ میں گزر گیا۔

رات کے غالباً ساڑھے نو کا وقت تھا۔ میں اپنے گھر میں تھا۔ دو آدمی آگئے تھے۔ ان کے ساتھ گپ شپ چلتی رہی۔ وہ چلے گئے اور میں لیٹ گیا۔ اونٹھ آ رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میری بیوی نے دروازہ کھولا اور مجھے آکر بتایا کہ ایک آدمی آیا ہے۔ اپنا نام علی رضا بتاتا ہے۔ کہتا ہے بہت ضروری کام ہے۔

علی رضا کا نام سن کر میں بیدار ہو گیا لیکن خیال آگیا کہ وہ علی رضا

نہیں ہو سکتا۔ اُس کے متعلق تو بتایا گیا تھا کہ نیم پاگل ہے۔ بہر حال میں اٹھا اور اُس سے بیٹھنے والے کمرے میں لے گیا۔ یہ وہی علی رضا تھا اور وہ اچھا بھلا تھا۔

”ایک خبر لایا ہوں۔“ اُس نے کہا۔ ”آپ اس تھانے میں سنتے آتے ہیں۔ میں اس تھانے کا پُرانا آدمی ہوں۔ مجھ پر ایسی مصیبت آپڑی کہ آپ کی خدمت کا موقع ہی نہ ملا۔“

”تم وہ خبر سناؤ جو لاتے ہو۔“

”آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ رحمار ہزن اشتہاری ملزم ہے۔ اُس نے کہا۔ ”وہ اس وقت میرے گاؤں میں ہے مگر آپ فوراً حرکت کریں تو اُسے گرفتار کر سکتے ہیں۔“

”وہاں کیا کر رہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”مکس کے گھر میں ہے؟“

”ایک شادی پر آیا ہوا ہے۔“ علی رضا نے جواب دیا۔ ”اُسی لڑکی کی شادی ہے جو لاپتہ ہو گئی تھی۔۔۔ شکوری۔۔۔ نانک زبیر کے ساتھ۔۔۔ رُجے کو زبیر نے بلایا ہے۔ باہر گانا بجانا ہو رہا ہے۔“

میں ساری بات سمجھ گیا۔ رُجے کو زبیر نے اس لئے شادی پر مدعو کیا ہو گا کہ رُجے نے شکوری کی عزت کی حفاظت کی تھی۔ علی رضا رُجے کی مخبری کرنے اس لئے آگیا تھا کہ رُجے نے اس شخص کو اپنی قید میں رکھ کر جہانی اور دماغی لحاظ سے بیکار کر دیا تھا۔ علی رضا رُجے سے انتقام لے رہا تھا۔ مجھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ علی رضا ہوش میں ہے یا پاگل پن کے دورے میں۔

”تمہیں عام طور پر کیا تکلیف ہوتی ہے؟“ میں نے کہا۔

”میں نے سنا ہے کہ تمہیں کوئی دماغی تکلیف ہو جاتی ہے۔“

”آپ نے ٹھیک سنا ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”دن میں دو تین مرتبہ ایسا دورہ پڑتا ہے کہ مجھے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ میں کیا کر رہا

ہوں۔ دورے کے بعد مجھے بتایا جاتا ہے کہ میں ہنستار باہوں یا روتا رہا ہوں یا دونوں ہی کام کرتا رہا ہوں۔ میرے جسم میں کوئی ایسی کمزوری پیدا ہو گئی ہے کہ جسم کی طاقت آدھی بھی نہیں رہی۔“ بولتے بولتے وہ مسکرایا اور کہنے لگا۔ ”آپ نکرہ کریں، میں اس وقت بالکل ہوش میں ہوں۔ رجمے رہزن کو دیکھ کر میں بالکل ہوش میں آ گیا ہوں۔“

میں نے اُس سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ اُس کی یہ حالت کس وجہ سے ہوتی ہے۔ مجھے یہ اعتبار آ گیا کہ اس وقت یہ شخص واقعی ہوش میں ہے۔ اچانک مجھے ایک خیال آ گیا۔ اس خیال کے تحت میں نے علی رضا سے کہا کہ وہ فوراً اپنے گاؤں چلا جاتے اور رجمے پر نظر رکھے۔ اگر رجمے پر پہنچنے سے پہلے وہاں سے چلا جاتے تو علی رضا دیکھے کہ وہ کدھر گیا ہے۔

علی رضا جانے کے لئے اٹھا اور بولا۔ ”میں نے نمبردار شکر کے ساتھ بات کی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ تم فوراً اُٹھا لے پنچو اور ملک صاحب سے کہو کہ دیر نہ کریں شکار ہاتھ سے نکل جاتے گا۔“

علی رضا گھوڑی پر آیا تھا۔ وہ باہر نکلا اور مجھے گھوڑی کے سر پر دوڑنے کی آواز سنائی دی۔

ایک مسلمان کانٹھیل میرے گھر کے چھوٹے موٹے کام کیا کرتا تھا۔ میں نے اُسے ایک الگ کمرہ دے رکھا تھا جہاں وہ رات کو سویا کرتا تھا۔ میں اُس کے کمرے میں گیا۔ اُسے گہری نیند سے اُٹھایا۔ اُس نے چادر باندھ رکھی تھی اور کُتر پہنا ہوا تھا۔

”یہی کپڑے پہنے رکھو۔“ میں نے اُسے کہا۔ ”سر پر دیہاتیوں کی طرح پگڑی لپیٹ لو اور فوراً نمبردار شکر کے گاؤں پنچو۔ وہاں ایک شادی ہو رہی ہے۔ ناچ گانا بھی ہو رہا ہے۔ رحمار بہزن وہاں موجود ہے۔“

تم نے اُسے کبھی دیکھا تو نہیں؟

”نہ جی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میں نے صرف سنا ہے، اُسے

دیکھا کبھی نہیں۔“

”تم نے اُس فوجی کو تو دیکھا ہے نا، جس کا نام زبیر ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”وہ تھانے میں بھی آتا رہا ہے۔“

”ہاں جی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اُسے تو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”تم بہت تیز چلو اور اُس گاؤں پنچو۔“ میں نے اُسے کہا۔ ”لیکن وہاں نہیں کوئی ایسا آدمی نہ دیکھ سکے جو تمہیں پہچانتا ہو۔ زبیر کی شادی ہو رہی ہے۔ پگڑی کا پلوٹنہ پر کر لینا اور کسی سے کہنا کہ زبیر کو بھیجو، بڑا ضروری کام ہے۔ زبیر جب آجاتے تو اُسے الگ اندھیرے میں لے جانا اور اُسے کہنا کہ مجھے ملک صاحب نے بھیجا ہے۔ اُنہوں نے کہا ہے کہ رجمے کو وہاں سے نکالو، مخبر ہی ہو گئی ہے اور رجمے سے کہو کہ گاؤں کے قبرستان کی طرف آجاتے۔ دل میں کوئی شک نہ رکھے۔ میں اُس کے ساتھ دو بائیں کروں گا اور اُسے نکال کر گاؤں پر چھاپ ماروں گا۔“

میں نے اس کانٹھیل کو خاصی زیادہ باتیں سمجھانی تھیں۔ آپ کو بہت تھوڑی شناسا رہا ہوں۔ اس کانٹھیل پر مجھے پورا اعتماد تھا۔ میں اس کا افسر تو تھا ہی لیکن افسری اتھتی سے ہٹ کر وہ معلوم نہیں کیوں میرا مرید بن گیا تھا۔ میرے اشارے پر وہ گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں وردی بہن کو بھانے گیا۔ ایک ہیڈ کانٹھیل اور آٹھ کانٹھیلوں کو گاؤں پر چھاپ مارنے کے لئے تیار کیا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ سب آرام آرام سے تیار ہوتے رہے۔ میں دانستہ وقت منانے کر رہا تھا۔ میں رجمے کو وہاں سے بھگانے کا انتظام کر چکا تھا لیکن چھاپ مارنا ضروری تھا۔ اگر میں چھاپ نہ مارتا تو علی رضا اور بہند و نمبردار سر کر وہ ہندوؤں کو بتا کر میرے خلاف شکایت اوپر پہنچا سکتے تھے کہ میں نے اطلاع ملنے کے باوجود چھاپ نہ مارا۔ میں اس لئے منانے کر رہا تھا کہ میرا کانٹھیل پہلے پہنچ جاتے اور رجمے کو وہاں سے کھسکا دے۔

میں نے نیکی کا صلہ دیا

میں اپنی گارڈ کو ساتھ لے کر چل پڑا۔ میں راستے میں سب کو بتاتا گیا کہ گاؤں کے تمام راستے بند کر کے رُحے رہزن کو پکڑنا ہے۔ ہو سکتا ہے مقابلہ ہو جائے۔ ہم چلتے گئے اور گاؤں سے کچھ دُور رہ گئے۔ مجھے اندازہ تھا کہ گاؤں کا قبرستان کس طرف ہے۔ ایک جگہ پہنچ کر میں نے گارڈ سے کہا کہ سب یہاں بیٹھ جائیں۔ میں ذرا آگے کا حال احوال دیکھ لوں۔ میں چمکے کاٹ کر قبرستان کی طرف چلا گیا۔ چاندنی ابھی کم تھی۔

”اکیلے ہو یا سارا تھانہ ساتھ لائے ہو“ میں قبرستان کے قریب پہنچا تو ایک آواز آئی۔

یہ آواز رُحے رہزن کی ہی ہو سکتی تھی۔ میں نے اُسے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ تھانے میں اُس کی تصویر موجود تھی۔ اشتہاری ملزموں کی تصویریں ہر تھانے میں رکھی جاتی ہیں۔ میں تھانے سے روانہ ہوتے وقت اُس کی فولٹو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

”آگے آ جا جسے؟“ میں نے کہا۔ ”فکر نہ کر“

وہ ایک بڑے چوڑے اور گھنے درخت کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ میں قریب گیا تو وہ سامنے آ گیا۔ میں نے اُس پر ٹارچ کی روشنی ماری پھر جیب سے تصویر نکال کر دیکھی۔ یہ اُس کی بُرائی تصویر تھی۔

”میں ہی رُحہا ہوں اُستاد!“ اُس نے کہا۔ ”تمہارا پیغام مل گیا تھا۔ دیکھتے تیرے دھڑے پر آ گیا ہوں“

”رُحے!“ میں نے کہا۔ ”میں نے کبھی کسی کو چھوڑا نہیں۔ تم تو جاں میں ایسے آتے تھے کہ نکل نہ سکتے تھے لیکن ایک نیکی کا صلہ

تمہیں ملنا چاہیے۔“

”تمہارے ساتھ میں نے کون سی نیکی کی ہے اُستاد!“ اُس نے کہا۔

”تم نیکی نہ کرتے تو آج یہ شادی نہ ہو رہی ہوتی جو اس گاؤں میں ہو رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے ایک نیک اور پاک لڑکی کو پاک ہی واپس کر دیا تھا۔ وہ میری کچھ منہیں لگتی رُحے! تم ڈاکو اور رہزن ہو کر ماتھے آیا ہو! اتنا خوبصورت مال امانت سمجھ کر واپس کر سکتے ہو تو میں تمہیں اُستاد!“ اُس نے کہا۔

”میں گارڈ ساتھ لایا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”گاؤں پر چھاپہ ماروں گا۔ تمہیں پہلے اطلاع کر دی تھی۔ جاؤ نکل جاؤ۔۔۔ ایک بات دماغ میں بٹھاؤ۔ میرے علاقے میں کبھی نہ آنا۔ میں کسی کو چھوڑا نہیں کرتا اور میں سودا بھی نہیں کیا کرتا۔“

”ساری عمر خادم رہوں گا۔“ اُس نے کہا۔ ”کبھی میری ضرورت پڑی تو اشارہ کر دینا۔۔۔ میں زبیر کے مجبور کرنے پر آ گیا تھا۔ وہ مجھے تک پہنچ گیا۔ میں ابھی اُسی ٹھکانے پر تھا۔ اُس نے کہا کہ تمہارے بغیر میری شادی مکمل نہیں ہوگی۔ تم نے میری امانت میں خیانت نہیں کی تھی۔ میں نے سوچا کہ ایک تو میں نے اس لڑکی کو بیٹی کہا تھا، دوسری وجہ یہ ہوتی کہ زبیر اہل مرڈ ہے۔ اُس نے اُس لڑکی کو گلے لگا لیا جسے اُس کے تمام رشتہ داروں اور بھائی نے دھتکار دیا تھا۔ بس یہی سوچ کر چلا آیا۔ لڑکی کو جوڑا اور سلامی دی تھی۔ وہ دسے چلا ہوں۔۔۔ مخبری کس نے کی تھی؟ تمہیں اطلاع کرنے تھانے کون کیا تھا؟“

”میں اپنے علاقے میں قتل کی واردات نہیں کرانا چاہتا۔“

میں نے کہا۔ ”جاؤ نکل جاؤ۔“

اُس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر دبایا اور ایک طرف نکل گیا۔ میں کوئی راستے نہیں دوں گا کہ میں نے اچھا کیا تھا یا بُرا، راستے آپ خود قائم کر لیں۔ اُس وقت میں نے جو محسوس کیا تھا اُس کے مطابق فیصلہ کر دیا۔

میں اپنی گارڈ کے پاس گیا اور کہا کہ گاؤں کے قریب پہنچ جاؤ، وہاں دیکھیں گے کہ شادی والی جگہ کو گھیرے میں لینا ہے یا کیا کرنا ہے۔ میں گارڈ کو ساتھ لے کر بہت تیز چلتا گاؤں کے قریب چلا گیا۔ دو آدمی میرے پاس آئے۔ ایک نمبر دار شکر تھا اور دوسرا علی رضا۔

”وہ تو نکل گیا ہے حضور!“ نمبر دار نے کہا۔ ”قبرستان کی طرف آیا تھا۔ ہم دونوں نے دُور دُور سے اُس کا پیچھا کیا۔ قبرستان میں چار پانچ آدمی اُس کے ساتھ ہو گئے۔ وہ اُس کے اپنے آدمی ہوں گے۔ ہمیں آگے جانے کی ہمت نہ ہوتی۔“

نمبر دار میں یا گاؤں کے کسی اور آدمی میں ہمت ہوتی بھی تو وہ رجمے کا پیچھا کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ رجمے کو اگر پتہ چل جاتا کہ مخبری کس نے کی ہے تو وہ اُسے قتل کر کے گاؤں سے نکلتا۔

میں نے علی رضا سے ویسے ہی کہہ دیا۔ ”تمہارا دشمن تو جال میں آکر نکل گیا ہے۔“

علی رضا اُس وقت تک ٹھیک تھا۔ میری بات سُنتے ہی اُس نے دھماکے کی طرح قہقہہ لگایا۔ میں ہلک گیا۔ پھر اُس نے آسمان کی طرف مُنہ کر کے اس طرح آواز نکالی جس طرح کُتے رو یا کرتے ہیں۔ کُتے کی اس آواز کو منگوں سمجھا جاتا ہے۔ میں نے اس شخص کو پہلی بار اس کیفیت میں دیکھا تھا۔ میں ڈر گیا۔ اُسے یہ دُورہ شاید اس صدمے سے پڑا تھا کہ اُس کا دشمن صاف پتہ نہ چل گیا تھا۔ دو تین آدمی آگے جو اُسے پکڑ کر اُس کے گھر لے گئے۔

میں نے اپنی کارگزاری کے لئے کچھ کرنا تھا۔ قانون کی رُو سے دیکھا

جاتا تو یہ نالک زبیر کا جُرم تھا کہ اُس نے ایک اشتہاری ملزم کو اپنے گھر بلایا اور پولیس کو اطلاع نہ دی۔ اگر میں اُسے خراب کرنا چاہتا تو میں اُسے اس جُرم میں گرفتار کر لیتا کہ اُس نے ایک اشتہاری ملزم کو اپنی پناہ میں رکھا ہے لیکن میں نے جو صورت حال پیدا کر دی تھی، اس میں میرے لئے ضروری تھا کہ میں زبیر کو بچانے رکھتا۔ میں نے چند ایک گواہ اکٹھے کئے اور اُن سے ایسے بیان لے کر قلمبند کئے جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہاں گانا بجانا اور بھانڈوں کا تماشا ہو رہا تھا اور رجمہ آگیا۔ نمبر دار اور علی رضا کے سوائے کسی نے بھی نہ پہچانا۔ نمبر دار نے فوراً بتھانے اطلاع دے دی۔ زبیر کا بیان ایسا لکھا جس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ رہزن کو جانتا ہی نہیں۔

میں پہلے کہ چکا ہوں کہ یہ کہانی ایسی ہے کہ اس کی ہر ایک تفصیل لکھنی چاہیئے کیونکہ بعض واقعات اس طرح لگتے ہیں جیسے یہ حقیقی نہیں۔ مثلاً رجمے کو نکال کر میں نے جو کارروائی کی اور جو بیان وغیرہ لئے وہ پورے آنے چاہتیں ورنہ پولیس والے کہیں گے کہ یہ شخص بندل بھینک رہا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس طرح کہانی بہت ہی لمبی ہو جاتے گی اور ایسی چیزوں سے بھر جاتے گی جو پڑھنے والوں کی دلچسپی کی چیزیں نہیں۔

میں نے کارروائی کی اور واپس آگیا۔

سینے میں خنجر اترتا ہوا تھا

دوروز اور گزرے تو میں نے ممتاز کی ماں کو پھر بلایا۔ پہلے کی طرح اُس کا خادمہ اور بیٹے طبعی ساتھ آگئے۔ میں چونکہ انہیں پریشان کرنا چاہتا تھا اس لئے انہیں باہر بٹھاتے رکھا۔ تقریباً ساڑھے تین گھنٹے بٹھا کر ممتاز کی ماں کو اندر بلایا۔ گاؤں میں وہ اونچی حیثیت کی عورت تھی لیکن

کون مار گیا ہے۔ اُس نے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا جو کسی کے پتے نہ پڑا۔
 فوراً بعد اُس نے آخری سانس لیا اور مر گیا۔
 چیلوں نے بتایا کہ خنجر مقتول کا اپنا تھا۔ اُسے جب جن بھوت نظر
 آتے تھے تو وہ یہی خنجر ہوا میں مارتا تھا۔

مجھے چونکہ معلوم تھا کہ یہ جو ساڈھو بنے ہوئے ہیں، سب جرائم پیشہ ہیں،
 اس لئے میں نے فیصلہ کر لیا کہ ان سب کو مشتبہوں میں رکھوں گا۔ میرا یہ خیال
 کہ شفاعت نے خودکشی کی ہے اس طرح رد ہو جاتا تھا کہ چیلوں نے ایک
 یا دو آدمیوں کو بھاگتے دیکھا تھا۔ وہ بتاتے تھے کہ ایک ہندو عورت
 بھی وہاں موجود تھی۔ چیلوں کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کس وقت چلی گئی تھی۔
 یہ امکان بھی تھا کہ اس عورت کے بھائی یا اُس کا خاوند کسی آدمی کو
 ساتھ لے کر آگیا۔ اپنی عورت کو لے گئے اور شفاعت کو قتل کر گئے۔
 اُس علاقے کی زمین کھوروں کے لئے سوزوں تھی۔ میرے ساتھ جو
 کانٹیلبل جا رہے تھے، ان میں سے ایک کو میں نے کہا کہ وہ کھوجی
 کو جگالائے۔ دیہاتی علاقے کی وارداتوں کی تفتیش میں کھوجی بہت مدد
 کیا کرتے تھے۔ اسی کانٹیلبل سے کہا کہ وہ منبردار شکر کو گُف کی طرف
 بھیج دے۔

گُف میں جا کے دیکھا۔ شفاعت پیٹھ کے بل پڑا تھا۔ اُس کے
 ایک ہاتھ نے ابھی تک خنجر کے دستے کو پکڑ رکھا تھا۔ خنجر دستے تک اُس
 جگہ اُترا ہوا تھا جہاں پسلیاں ختم ہوتی ہیں اور معدہ شروع ہوتا ہے۔
 میں نے اُس کے جسم کو دیکھا۔ خنجر کا ایک زخم پیٹھ کے ناف کے
 دائیں طرف تھا، دوسرا بائیں طرف سینے میں اور تیسرے دائیں قاتل
 خنجر مقتول کے پیٹ میں چھوڑ گیا تھا۔ تین زخم بتاتے تھے کہ شفاعت نے
 خودکشی نہیں کی۔ خودکشی کی صورت میں خنجر اُس کے پیٹ یا سینے میں اُترا
 ہوا ہوتا، تین زخم نہ ہوتے۔ یہ واردات قتل کی ہی تھی۔
 میں نے چیلوں سے پوچھا کہ وہ فوجی (ناٹک زبیر احمد) دن کو

یہاں آیا تھا؟ انہوں نے بتایا کہ نہیں آیا تھا۔

پیاسی بیوہ

شکر منبردار کو کانٹیلبل نے بتا دیا تھا کہ ساڈھو قتل ہو گیا ہے۔
 شکر نے عقل سے کام لیا کہ وہ چار پاتی اور چار پانچ آدمیوں کو ساتھ لے
 آیا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اے۔ ایس۔ آئی زبیر کو مٹھانے لے گیا ہے۔
 میں نے وہ کارروائی مکمل کی جو اس قسم کی وارداتوں میں کی جاتی
 ہے۔ شکر سے کہا کہ وہ لاش چارپائی پر رکھوئے اور اُس کے چار آدمی لاش ہسپتال میں
 لے جائیں۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لئے جا رہی تھی۔ پوسٹ مارٹم قبضے کے
 سرکاری ہسپتال میں ہونا تھا۔ کھوجی ابھی نہیں آیا تھا۔ میں نے چیلوں
 کے بیان لینے شروع کر دیے۔ میں ہر ایک کو الگ بٹھا کر بیان لے
 رہا تھا۔ اُن پر جرح بھی کی۔ میں اس شک پر پوچھ چڑھ کر رہا تھا کہ یہ تینوں
 چیلے دراصل جرائم پیشہ ہیں اس لئے یہ ممکن ہے کہ ان کی آپس میں کسی وجہ
 سے دشمنی پیدا ہو گئی ہو اور انہوں نے مل کر شفاعت کو قتل کر دیا ہو
 میں نے سب سے پہلے اُس چیلے کو الگ کر کے اپنے پاس گُف
 سے باہر زمین پر بٹھالیا جو مٹھانے رپورٹ دینے آیا تھا۔ دو چار روز
 پہلے بھی یہ شخص میرے پاس آیا تھا۔ میں نے اس پر غماز نہیں ہونے
 دیا تھا کہ میں شفاعت کی اور اُس کی اصلیت سے واقف ہوں۔ اب بھی
 وہ میرے آگے ساڈھو بنا ہوا تھا۔

”تمہارا اصل نام کیا ہے؟“ میں نے اُس سے پوچھا۔

اُس نے اپنا کوئی ہندو نام بتایا۔

”میں اصل نام پوچھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”جس طرح تمہارے

گور و مہاراج کا نام شفاعت علی تھا اسی طرح تمہارا اصل نام کچھ اور ہے
 میں جانتا ہوں تم کون لوگ ہو۔ تم جب پہلی بار میرے پاس مٹھانے

میں آئے تھے، مجھے اُس وقت بھی تمہاری اصلیت کا علم تھا۔ میرے اس احسان کو نہ بھولو کہ میں نے تم لوگوں پر پردہ ڈال رکھا ہے میرے ساتھ دوستوں کی طرح بات کرو۔“

اُس نے اپنا نام بتایا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ وہ مسلمان تھا۔ میں نے اسے کہا کہ شفاعت کے قتل کا واقعہ بالکل صحیح سنا دو۔

اُس نے ایک تو شفاعت کی وہی ذہنی کیفیت سنائی جو وہ مجھے پہلے بھی سنا چکا تھا، پھر اُس نے سنایا کہ شفاعت کس طرح قتل ہوا ہے۔ یہ بھی آپ کو سنا چکا ہوں۔ شفاعت کو اب وہ استاد کہتا تھا۔

”رات کو ہم شور سے جاگے تو استاد (شفاعت) گف میں باہر سے آ رہا تھا۔“ اس چیلے نے کہا۔ ”میں تو یہی سمجھا تھا کہ استاد نے خود ہی اپنے سینے میں خنجر مار لیا ہے لیکن ایک یادو آدمیوں کو بھاگتے دیکھا تو مجھے خیال آیا کہ استاد کو کوئی مار گیا ہے.... استاد کے پاس ایک ہندو عورت آتی تھی۔ میں اُسے آنکھیں بند کر کے بھی بچان سکتا ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ جوانی میں بیوہ ہو گئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہندو عورت نو عمری میں بیوہ ہو جاتے تو بھی اُس کی دوسری شادی نہیں ہو سکتی۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ جوانی میں بیوہ ہو جانے والی ہندو عورتیں اپنی تسکین کے لئے کیا کیا کرتی ہیں۔ انہیں مندر میں، آشرم میں اور ہم جیسے سادھوؤں کے پاس جانے سے کوئی نہیں روکتا۔ آپ جانتے ہوں گے کہ پنڈت وغیرہ انہیں کس راستے پر چلا لیتے ہیں....“

”یہ عورت ایک چینی سے استاد کے پاس شگنی اور شانتی (امن و سکون) کے لئے آ رہی تھی۔ اچھی خوبصورت عورت ہے۔ عمر پچیس چھییس سال ہے۔ پہلے پہل وہ پختے دل سے روحانی سکون کے لئے آتی تھی۔ استاد نے اس پر اپنا اثر ڈال لیا۔ پہلے دن کو کبھی کبھی آتی تھی۔ استاد نے اُسے ایک روز کہا کہ رات کو آتے۔ وہ آگئی۔ استاد نے اُسے جسمانی سکون دے دیا۔ آج رات وہ دوسری بار آتی تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ رات کو

وہ گھر والوں سے چوری آتی ہوگی۔“

اس کا مطلب یہ تھا کہ دن کے وقت وہ گورو یا سوامی مہاراج کے پاس آتی اور رات کو اس کا گورو شفاعت بن جاتا تھا۔ وہ شفاعت کے جال میں آگئی تھی۔ اُسے کسی نہ کسی کے جال میں آنا ہی تھا۔ ہندو خاندن کے مرجانے کی سزا اُس کی بیوہ کو دیتے ہیں۔ بیوہ جو ابھی جوانی کے عروج کو بھی نہ پہنچی ہو، وہ انتقامی جذبے کے تحت تسکین کا درپردہ انتظام کر لیتی ہے۔

میرے پوچھنے پر اس چیلے نے بتایا کہ اُسے معلوم نہیں کہ وہ کون سے گاؤں سے آتی ہے۔ وہ کہتا تھا کہ ایک تو نمبردار شکر کا گاؤں ہے اور اس سے میل سوا میل دور ایک اور چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہ عورت ان دونوں میں سے کسی ایک گاؤں کی رہنے والی تھی۔

اس شخص کو میں نے بڑی اچھی طرح کھنگال لیا۔ اس پر مجھے کوئی شک نہ ہوا۔ باقی دو چیلوں کے بھی بیان ملتے۔ انہوں نے بھی وہی کچھ کہا جو میں ایک سے سُن چکا تھا۔ یہ اس عورت کو پہچانتے تھے، یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کون سے گاؤں سے آتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان دونوں کو شفاعت نے نوکر بنا کر رکھا ہوا تھا۔ پہلا چیل شفاعت کا دست راست تھا میں نے شکر نمبردار سے پوچھا کہ اُس کے گاؤں میں کوئی جوان ہندو بیوہ ہے؟ عمر پچیس چھییس سال ہونی چاہیے۔ اُس نے بتایا کہ دو ہیں لیکن دونوں کی عمریں تیس سال سے خاصی زیادہ ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ بیوہ خوبصورت ہے، رنگ گورا ہے۔ شکر نے بتایا کہ ان دونوں کو خوبصورت نہیں کہا جاسکتا۔

”پھر ایک کام کرو۔“ میں نے شکر سے کہا۔ ”کسی سیانے آدمی کو لپٹالی (دوسرا گاؤں) بھیجو۔ وہاں وہ کسی اور کام کے بہانے جاتے اور معلوم کرے کہ اس گاؤں میں کوئی جوان بیوہ ہے، وہ کون ہے؟“

لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھیجواتے، بیان لیتے اور دیگر کارروائیاں

عام ہے۔ عورت اطمینان سے چلتی آرہی ہے۔ گف سے دس بارہ قدم دور لے جا کر کھوجی لے یہی کھڑے مجھے دکھاتے۔ قدموں کے درمیان فاصلہ زیادہ تھا۔ کھوجی نے کہا کہ عورت دوڑتی جا رہی ہے۔ وہ واپسی کے کھڑے تھے۔ یعنی عورت چلتی ہوئی گف کی طرف آتی اور دوڑتی ہوئی واپس گئی۔ یہ کھڑا کچھ دور تک گیا۔

آگے چھوٹا سا کھڑا تھا جو بمشکل ایک فٹ چوڑا اور آٹھ انچ گہرا ہو گا۔ اس کے قریب سیلپر کا ایک پاؤں پڑا تھا۔ معاملہ صاف تھا۔ دوڑتے دوڑتے اس عورت کا پاؤں اس کھڑے میں آگیا اور سیلپر کا ایک پاؤں اتر گیا۔ وہ ڈری اور گہرائی ہوتی تھی۔ وہ سیلپر پہننے کے لئے نہڑکی آگے کھڑے اس طرح تھے کہ ایک نیلے پاؤں کا اور دوسرا سیلپر کا تھا۔ پھوٹا آگے جا کر دونوں کھڑے نیلے پاؤں کے ہو گئے تھے۔ عورت نے سیلپر اتار کر شاید ہاتھ میں لے لیا تھا۔

یہ کھڑے آگے جا کر ختم ہو گئے۔ زمین پتھر ملی تھی اور آگے برساتی نالہ تھا جس میں تھوڑا تھوڑا پانی تھا۔ کھڑے ندی تک لے گئے۔ نالے کے پار پشمالی گاؤں تھا۔ میں جان گیا کہ عورت اس گاؤں میں گئی ہے۔

کھوجی مجھے ایک اور طرف لے گیا۔ وہاں دو مردانہ کھڑے تھے جو ایک اور طرف سے برساتی نالے تک چلے گئے تھے۔ کھوجی مجھے گف کے اوپر لے گیا۔ ایک گھائی اترتی تھی۔ یہی کھڑے گھائی سے اتر رہے تھے۔ بات صاف تھی۔ یہ دو آدمی تھے جو گھائی سے اتر کر گف میں آئے اور شفاعت کو قتل کر کے برساتی نالے کی طرف بھاگ گئے۔ عورت شفاعت کے پاس تھی۔ وہ ان آدمیوں کو دیکھ کر اپنے گاؤں کو بھاگ گئی۔

بعض کھڑے اتنے صاف تھے کہ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ ان کے مولد تیار کرانے کا انتظام کرے۔

نمبر دار شکر نے جس آدمی کو پشمالی گاؤں بھیجا تھا وہ آگیا۔ اس نے بتایا کہ کشوری نام کی ایک عورت جس کی عمر پچیس چوبیس سال ہے،

کرتے صبح ہو گئی۔ کھوجی کو اسے دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ صبح طلوع ہوتے ہی اس نے کھڑے ڈھونڈنے کا کام شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی قریبی گاؤں کے ہندوؤں نے دھاوا بول دیا۔ انہیں صبح صبح پتہ چلا تھا کہ ان کا ساؤدھو قتل ہو گیا ہے۔

کھوجی کو کھڑے مل گئے تھے اور اس نے مجھے دور اسے بتا کر کہا کہ ادھر سے کوئی آدمی نہ گزرے، ورنہ کھڑے مٹ جائیں گے۔ میں نے دو کانسٹیبلوں کو اور شکر نمبر دار کے دو مہین آدمیوں کو مختلف جگہوں پر بھیج دیا کہ وہ ادھر سے کسی کو گزرنے نہ دیں۔

کوئی ایک گھنٹہ گزرا ہوا گاؤں کے قبضے کے پانچ چھ ہندو آگئے۔ ان میں وہ دو ہندو بھی تھے جو ایک بار میرے پاس تھا۔ میں یہ شکایت لے کر آئے تھے کہ میں نے ان کے ساؤدھو کو پکڑ لیا ہے اور وہ دوسری بار مجھ سے معلوم کر لے آئے تھے کہ یہ ساؤدھو مسلمان تو نہیں! اب وہ ساؤدھو کے قتل کی خبر سن کر آئے تھے۔ انہوں نے میرے ساتھ ایسے انداز سے بات کی جیسے مجھ سے جواب طلبی کر رہے ہوں۔ میں نے انہیں کہا کہ وہاں سے دور چلے جائیں اور میرے کام میں دخل نہ دیں۔ وہ پرے تو چلے گئے لیکن ایسے لگتا تھا جیسے میرے سر پر سوار ہو گئے ہوں۔

میں نے ان کی طرف ذرا سی بھی توجہ نہ دی۔

”جہاں کہو گے آجاؤں گی“

دواڑھائی گھنٹوں بعد کھوجی میرے پاس آیا اور مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ اس نے مجھے کھڑے دکھاتے۔ ایک کھڑا نانہ پاؤں کا تھا۔ اس نے سیلپر پہن رکھے تھے۔ اس زمانے میں چڑے کے سیلپر ہوا کرتے تھے۔ یہ کھڑے گف کی طرف آ رہے تھے۔ کھوجی لے بتایا کہ ان کھڑوں کی چال

عرصہ دو سال سے بیوہ ہے اور وہ گورے رنگ کی خوبصورت عورت ہے۔
میں نے وقت ضائع نہ کیا۔ شکر منبر دار، ایک ”معزز“ ہندو،
شفاغت کے ایک چیلے اور کھوجی کو ساتھ لے کر پٹھالی کی طرف چل پڑا۔
برساتی نالے سے پار گئے تو ایک جگہ کھوجی نے عورت کا کھڑا کچھ لیا۔ آگے
گھسی گھاس تھی۔ گاؤں سامنے نظر آ رہا تھا۔ آگے کھڑا نہ ملا۔ ٹٹنے کی توقع
بھی نہیں تھی۔ دیرمات کے لوگ بہت سویرے جاگ اٹھتے تھے۔ مردیشوں
کو بھی گھروں سے نکال دیتے تھے۔ یہ کھڑوں کو مٹا دیتے تھے۔
یہ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ہمیں دیکھ کر گاؤں کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔
میں نے انہیں کہا کہ کشوری کا گھر کون سا ہے۔ انہوں نے گھر دکھا دیا۔ میں
اپنی پارٹی کے ساتھ اس گھر کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ ایک بوڑھا ہندو
باہر آیا تو مجھے دیکھ کر اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں
کشوری کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس ہندو کے منہ سے بات نہیں نکل رہی
تھی۔ شکر نے مجھے دھیمی آواز میں کہا کہ اندر چلے چلو۔ میں نے اس آدمی
سے پوچھا کہ کشوری کون ہے؟ اُس نے ڈری ہوئی سرگوشی میں بتایا کہ
کشوری اُس کی بیٹی ہے۔

میں اندر چلا گیا اور کشوری کے باپ سے کہا کہ کشوری کو سامنے
لائے۔ وہ کمرے میں گیا اور ایک خوبصورت لڑکی کو اس طرح ساتھ لایا
جیسے اُسے گھسیٹ رہا ہو۔ میری تسلی اور دلا سے پر لڑکی مجھ تک پہنچی۔
وہ تو نوجوان لڑکی لگتی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ اپنے سیلپر مجھے دکھائے۔
وہ خوفزدگی کی حالت میں میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔ صحن میں کچھ
جگہ دھول والی تھی۔ میں کشوری کو بازو سے پکڑ کر وہاں لے گیا اور واپس
لے آیا۔ وہ اُس وقت ننگے پاؤں تھی۔ میرے کپے بغیر کھوجی وہاں گیا اور
اُس نے کشوری کا کھڑا کچھ کر مجھے سر کے اشارے سے بتایا کہ وہی کھڑا ہے۔
”دیکھو لالہ جی!“ میں نے کشوری کے باپ سے کہا۔ ”اپنی بیٹی
کے سیلپر کا ایک پاؤں میرے حوالے کر دو، ورنہ میں سارے گھر کی تلاشی

لوں گا۔“

ظاہر تھا کہ کشوری رات کو چوری چوری گھر سے نکلی اور شفاغت تک
پہنچی تھی۔ اُس کے باپ کے لئے بڑی اذیت ناک صورت حال پیدا ہو گئی
تھی۔ کشوری کی ماں بھی آگئی تھی۔ وہ کبھی میرے آگے ہاتھ جوڑتی کبھی
شکوری کو کوسنے لگتی۔ وہاں جو منظر بن گیا تھا وہ میں پوری طرح بیان نہیں
کر رہا۔ کہانی پہلے ہی بڑی لمبی ہو گئی ہے۔ مختصراً یہ کہ میرے ڈرائے
دھمکانے سے کشوری نے سیلپر کا دوسرا پاؤں لاکر میرے آگے رکھ دیا۔
میں نے سیلپر کا وہ پاؤں جو وہ راستے میں پھینک آتی تھی، کانشیل
سے لے کر سب کو دکھایا۔ دونوں پاؤں اکٹھے رکھ دیتے۔ دونوں پاؤں
ایک جیسے تھے۔ یہ ایک جوڑے کے پاؤں تھے۔ میں نے کشوری کو سب
سے الگ کر لیا۔

”تمہیں بولنا پڑے گا کشوری!“ میں نے کہا۔ ”سچ بول دو
گی تو میں تمہارے سر پر ہاتھ رکھ دوں گا.... اس میں کوئی شک نہیں
کہ تم رات سادھوؤں کی گف میں گئی تھیں۔“
”کسی طرح آپ پردہ نہیں ڈال سکتے؟“ اُس نے پوچھا اور
ادھر ادھر دیکھ کر دھیمی اور قدرے شرمیلی آواز میں بولی۔ ”میں
نے مان لیا ہے کہ میں وہاں گئی تھی.... آپ کہیں گے تو....“ اُس نے
سر جھکا لیا۔

میں اُس کا اشارہ سمجھ گیا۔ میں نے اُس کے آگے مومن بننے کی
کوشش نہ کی۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اُسے اپنے حُسن اور اپنی جوانی
پر ناز ہے اور اپنی قیمت بھی جانتی ہے.... میں اُسے پرے لے گیا منبر دار
شکر ایک چارپائی اٹھاتے دوڑا آیا۔ دو آدمی بستر اور بیچے اٹھاتے آ
گئے۔ پلک جھپکتے میرے لئے بستر بچھ گیا۔

”تو زمین پر بیٹھ جا“ منبر دار نے کشوری سے کہا۔

”میری بات دھیان سے سننا کشوری!“ جب سب پرے چلے

گئے تو میں نے اُسے کہا۔ ”سادھو قتل ہو گیا ہے۔ تم جب تک نہیں بتاؤ گی کہ وہ کس طرح قتل ہوا ہے میں تم پر پردہ نہیں ڈال سکوں گا۔“
 ”میں وہاں گئی تھی۔“ اُس نے کہا۔ ”سادھو مہاراج کے چیلے سو گئے تو سادھو مہاراج نے بستر پر ہاتھ مار کر مجھے اشارہ کیا۔ میں اُن کے قریب ہوتی ہی سمجھتی کہ دو آدمی اندر آتے۔ مہاراج نے اپنے ٹیکے کے نیچے سے خنجر نکالا اور اُسٹھ کھڑے ہوئے اور اُنہوں نے خنجر والا بازو اتنی زور سے گھمانا شروع کر دیا جیسے وہ ان دونوں آدمیوں کو چیر ڈالیں گے۔ مہاراج نے کئی بار کہا۔ ”آج تم انسانوں کے روپ میں آتے ہو۔ آج تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ دونوں آدمی پیچھے ہٹتے ہٹتے گُف سے نکل گئے۔ مہاراج تو جیسے پاگل ہو گئے تھے۔ وہ بڑی تیزی سے خنجر گھماتے اُن کے پیچھے گئے۔۔۔ ایک آدمی کی آواز سنائی دی۔ ”ختم کر سالے کو۔“ میں گُف سے دوڑتی نکلی اور وہاں سے بھاگ آئی۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی۔“

”اُن آدمیوں کے ہاتھوں میں کوئی ہتھیار تھا؟“ میں نے پوچھا۔
 ”چاقو، چھری، خنجر، کلہاڑی؟“
 ”کلہاڑی ہوتی تو نظر آ جاتی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میں نے ان کے ہاتھوں میں کوئی ہتھیار نہیں دیکھا۔“
 ”اگر وہ دونوں آدمی تمہارے سامنے کھڑے کتے جاتیں تو تم انہیں پہچان لو گی؟“

”میں نے لائین کی روشنی میں اُن کے چہرے اچھی طرح دیکھے تھے۔“ اُس نے کہا۔ ”ایک کو میں دیکھوں تو پہچان لوں گی، دوسرے کو میں جانتی ہوں۔“

”جانتی ہو؟“ میں نے خوشی سے اُچھلے ہوئے پوچھا۔
 ”لیکن اُس کا نام بتاتے ہوئے ڈرتی ہوں۔“ اُس نے کہا۔
 ”وہ زبردست غنڈہ اور بد معاش ہے۔ ہمارے گاؤں کا رہنے والا ہے۔“

اگر اُسے پتہ چل گیا کہ میں نے اُس کا نام لیا ہے تو وہ میرے سارے خاندان کا جینا حرام کر دے گا۔ میرا تو وہ دشمن ہے۔“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔ ”تمہارے ساتھ اُس کی کیا دشمنی ہے؟“
 ”میری خواہش کرتا ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”مجھے وہ اچھا نہیں لگتا۔ ہندو ہے لیکن بہت بد معاش ہے۔ شراب کے نشے میں بدمست رہتا ہے اور بکواس کرتا رہتا ہے۔ میں تو اُس کے جسم کی برکوبرداشت ہی نہیں کر سکتی۔۔۔ اگر آپ مجھ پر پردہ ڈالے رکھیں تو میں آپ کو ایک اور بات بتاؤں۔“

”میں تمہاری ہوا بھی کسی کو دیکھنے نہیں دوں گا۔“ میں نے کہا۔
 ”میں اس شخص کی بد معاشی ایک منٹ میں ختم کر دوں گا۔ تمہاری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکنا۔ تم بات کر دو۔“

”میں نے پہلے یہ بات دل میں رکھ لی تھی۔“ اُس نے کہا۔
 ”میں سادھو مہاراج کے پاس تھی تو یہ دو آدمی گُف میں آتے ہیں۔ اس بد معاش کو پہچان لیا اور اُس نے مجھے پہچان لیا۔ اُس نے کہا۔ ”یہ تو ہماری جان بیٹھی ہوتی ہے۔ پہلے جوگی مہاراج (شفاعت) کا حساب برابر کر لیں پھر اپنی جان سے گلے ملیں گے۔“ سادھو مہاراج نے اُن پر خنجر سے حملہ کر دیا تو وہ دونوں باہر نکل گئے اور مجھے بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔۔۔ اُس کا نام گوپال داس ہے اور داسا کہلاتا ہے۔“

ساس ہو ہوتا ہے میں

میں نے شکر نمبردار کو بلایا اور اُس سے پوچھا کہ وہ داسا کو جانتا ہے؟ اُس نے کہا کہ اُسے تو سارا علاقہ جانتا ہے۔ شکر کو اُس کا گھر بھی معلوم تھا۔ میں نے کشوری کے باپ کو کہا کہ کشوری یہیں رہے گی اور وہ گھبراہٹیں نہیں۔ ڈرنے والی کوئی بات نہیں۔ میں نے شکر نمبردار

اور دو کانٹیلوں کو ساتھ لیا اور شکر کی راہنمائی میں واسا کے دروازے پر جا پہنچا۔

دروازہ کھلا تھا۔ معمولی سادہ پاتی طرز کا مکان تھا۔ میں دستک دیتے بغیر اندر چلا گیا۔ صحن میں دو عورتیں تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر اور ایک جوان۔ اُن سے پوچھا، واسا کہاں ہے؟ وہ چپ رہیں۔ وہ بہت ڈر گئی تھیں۔ جوان عورت نے کمرے کی طرف دیکھا۔

میں اندر چلا گیا۔ چار پاتی پر ایک آدمی بڑی گہری نیند سویا ہوا تھا۔ شکر نے مجھے بتایا کہ یہ ہے واسا۔ میں نے اُس کے سر کو جھنجھوڑا۔ اُس نے ”اُوں ہوں“ کہہ کر روٹ بدل لی۔ شکر اور ایک کانٹیل اُسے بھنجوڑنے لگے۔

”او، کیا مصیبت آگئی ہے؟“ اُس نے اُمٹتے ہوئے غصے سے کہا۔ ”کیا ہے؟“

اُس نے میری طرف دیکھا تو اُس کے مُنہ سے ”اوہ“ نکل گئی۔ وہ بڑی تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اُس کے کپڑے دیکھے۔ بالکل صاف تھے۔

”واسے دوست!“ میں نے کہا۔ ”رات والے کپڑے دے دو“

”کون سے کپڑے؟“

میں نے اُس کی جوتی دیکھی جو چار پاتی کے ساتھ پڑی تھی اور کھوجی کی طرف دیکھا۔ اُس نے واسا کی جوتی اُٹھا کر اُس کے تلوے دیکھے۔ پھر میری طرف دیکھ کر اُس نے سر کا ہلکا سا اشارہ کیا۔ کھڑا اسی جوتی کا تھا۔

”واسے!“ میں نے کہا۔ ”میں نے کہا تھا رات والے کپڑے دے دو۔ تلاشی میں کپڑے برآمد ہوتے تو مجھ سے رعایت کی توقع نہ رکھنا۔ تمہارے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے واسے!“

”میرا قصور کیا ہے حضور؟“ اُس نے پوچھا۔

”مکان کی تلاشی لو۔“ میں نے کہا۔

ایک کانٹیل صحن میں نکل گیا۔ رستی پر پا جامہ اور کُتر پڑے ہوئے تھے۔ دھوکہ ڈالے گئے تھے۔ کانٹیل نے دونوں کپڑے اُتار لئے۔ میں نے دونوں عورتوں سے پوچھا کہ یہ کپڑے کس نے دھوئے تھے؟..... دونوں نے ایک دوسری کی طرف دیکھا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا۔

”میرے گھر کی کسی عورت کے ساتھ بات نہ کرنا تمہارا صاحب!“

— واسا جو مجھ سے چار پا پرخ قدم دُور کھڑا تھا، بولا۔ ”مجھ سے پوچھو کیا پوچھتے ہو؟“

میں نے اُس کے قریب جا کر اُس کے مُنہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ وہ اپنے گھر کی عورتوں کے سامنے جا گرا۔

”ان سب کو تھانے لے چلو!“ میں نے کہا۔

واسا بہت ساجت پر آ گیا۔ میں نے اُس کی ایک نہ سنی اور اُسے اور اُس کے گھر کی دونوں عورتوں کو باہر لے گیا۔ ایک اُس کی ماں اور دوسری اُس کی بیوی تھی۔ میرے ساتھ دو کانٹیل تھے۔ میں نے پا جامے اور کُترے کی برآمدگی کے کاغذات تیار کئے اور گواہوں کے دستخط کرائے۔

ان تینوں کو میں تھانے لے جانے لگا تو دونوں عورتیں ہاتھ جوڑ کر میرے آگے آگئیں لیکن میں نے پرواہ نہ کی۔ ایک کانٹیل کے پاس پہنچکڑی تھی جو میں نے واسا کو گمادی اور اُسے اُس کی ماں اور بیوی کے ساتھ تھانے کو روانہ کر دیا۔ ایک آدمی سے کہا کہ وہ شفاعت کی کُف کو جاتے اور تینوں چیلوں اور کانٹیلوں کو تھانے پہنچنے کو کہے۔ میں خود کشوری کے گھر چلا گیا اور اُس کے باپ سے کہا کہ وہ کشوری کے ساتھ تھانے چلا چلے۔ میں نے اُسے تسلی دی کہ اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔

میں جب بتھانے پہنچا تو دن کے تین بج رہے تھے۔ میں نے داسا کو الگ، اُس کی ماں کو الگ اور اُس کی بیوی کو الگ بٹھا دیا۔ شفاعت کے چیلے پہنچ چکے تھے۔ میں نے انہیں اپنے دفتر میں بلا کر کہا کہ باہر ایک آدمی (داسا) بیٹھا ہے، اسے اچھی طرح پہچان لیں۔ میں انہیں موقعہ کے گواہوں کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔ داسا کو ہتھکڑی لگی ہوتی تھی۔ میں نے تھوڑی دیر بعد اُسے حوالات میں بند کر دیا۔

میں ایف۔ آئی۔ آر اور دیگر کاغذات تیار کرنے میں مصروف ہو گیا۔ میں داسا اور اُس کی عورتوں سے آدھی رات کے بعد پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔ شام کے بعد میں اپنے گھر چلا گیا۔ کشوری اور اُس کے باپ کے سونے کا کھانے کا میں نے انتظام کر دیا تھا۔

ایک ٹکٹ میں دو مزے

رات ڈیڑھ بجے کے قریب میں بتھانے میں آیا اور داسا کو حوالات سے نکلوا کر اپنے کمرے میں بٹھالیا۔

”داسے!“ میں نے کہا۔ ”اقبالی بیان دے دے۔ تیری ماں اور بیوی نے رورور کیا بیان دے دیتے ہیں۔“ یہ میں نے ہوا میں تیر چلا یا تھا۔ ان دونوں عورتوں کے ساتھ تو میری بات ہی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے داسا سے کہا۔ ”یہی پاجامہ اور کڑتہ بتھانا، جو تم نے قتل کے وقت پہنا ہوا تھا.... تم تو بالکل اناڑی ہو۔ تمہیں معلوم نہیں تھا کہ بد معاشی کچھ اور چیز ہے اور قتل بڑا ہی مختلف معاملہ ہے۔ تم نے اتنی سی بھی احتیاط نہ کی کہ تمہارے گاؤں کا ایک عینی شاہد وہاں موجود تھا اور تم نے گاؤں میں اگر اُس کا منہ بند کرنے کی نہ سوچی۔ تم مزے سے اور دوپہر تک سوتے ہی رہے.... یہ بھی سوچ لو کہ عینی شاہد تین اور

آدمی تھے۔ وہ مقتول سادھو کے چیلے ہیں۔“ یہ غلط ہے۔ اُس نے اناڑیوں جیسی بات کی۔ وہ تینوں وہاں نہیں تھے، وہ موقعہ کے گواہ کس طرح ہو سکتے ہیں؟۔ اتنا کہہ کر وہ چونک پڑا۔ اُس کا رنگ بدل گیا۔ لیکن اُس کے منہ سے جو الفاظ نکل گئے تھے، وہ واپس منہ میں نہیں جاسکتے تھے۔

میں نے اُس کے کندھے پر ہلکی سی پٹکی دی۔ وہ تو بالکل ہی اناڑی تھا۔ ایسے آدمی کو ہم بھوکا بد معاش کہا کرتے تھے۔ میرے ذہن میں قتل کی وجہ یہ آتی کہ یہ شخص کشوری کے پیچھے پڑا ہوا تھا مگر کشوری شفاعت سادھو کی ہو کے رہ گئی تھی۔ داسا نے شفاعت کو راستے سے ہٹا دیا۔ اُس نے کشوری کو ادھر آتے دیکھ لیا ہوگا۔

”داسے!“ میں نے کہا۔ ”اپنی ماں اور بیوی کی عزت آبرو کا خیال کر اور بول پڑ، پھر دیکھ میں تجھے کس طرح نکالتا ہوں۔ جھوٹ سے اور چھپانے سے تم بھانسی سے نہیں بچ سکو گے۔ میں موقعہ کے جھوٹے گواہ حالت میں لے جا کر تمہیں سزائے موت دلا دوں گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تم قاتل ہو۔ سیدھی بات کرو اور زندہ رہو۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اُس کا سر جھک گیا۔ میں انتظار کرتا رہا۔ ڈیڑھ ایک منٹ بعد اُس نے شکست کے لیے میں کہا۔ ”شہر کے دو آدمیوں کو بلا دیں.... لالہ گھنیش چند اور سیٹھ بنارسی داس.... میں اُن کے سامنے بیان دوں گا۔“

”اُن کے سامنے کیوں؟“ میں نے پوچھا۔ ”اور یہ تو بتاؤ کہ تمہارے ساتھ دوسرا آدمی کون تھا؟“

میرا جواب سن کر اُس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور معافی مانگی اور چلا گیا۔ میں داسا کے پاس آیا اور اُس سے پوچھا کہ وہ لالہ گھنیش چند اور سیٹھ بنارسی داس کو کیوں بلانا چاہتا ہے؟

”ہم دونوں سے ساڈھو کو انہوں نے ہی قتل کر لیا ہے۔“
 داسا نے کہا۔ ”کتے تھے کہ تم پکڑے نہیں جاؤ گے۔ پکڑے گئے تو
 تمہیں چھڑالیں گے۔“

داسا کا بیان بڑا لمبا تھا۔ میں آپ کی دلچسپی کی بات سنا دیتا ہوں۔
 لالہ گھنیش اور سیٹھ بنارسی داس قبضے کے دو متمند تاجر تھے اور وہ وہاں
 کے لیڈر تھے۔ یہی دو ہندو پہلی بار اپنے ”ساڈھو“ کی گرفتاری پر
 میرے پاس آئے تھے اور دوسری بار مجھ سے پوچھنے آئے تھے کہ یہ
 ساڈھو مسلمان تو نہیں۔ انہوں نے مجھے کہا تھا کہ ان کے اپنے مخبر ہیں
 جو پتہ چلا لیں گے کہ یہ ساڈھو (شفاعت) جعلی ہے یا اصلی۔

انہوں نے کسی طرح معلوم کر لیا کہ یہ ساڈھو جعلی ہے اور مسلمان
 ہے۔ یہ پتہ پریتو نے چلایا تھا۔ لالے اور سیٹھ نے اُسے کہا کہ اس ساڈھو
 کو قتل کر دو اور پانچ سو روپیہ نقد وصول کرو۔ پریتو نے پانچ سو روپیہ
 لے لیا۔ داسا اس کا دوست تھا۔ پریتو داسا کے گاؤں گیا اور اُسے
 اڑھائی سو روپیہ دے کر شفاعت کے قتل پر آمادہ کر لیا۔

دونوں نے قتل کی رات مقرر کر لی۔ پریتو نے کہا کہ چھری چاقو

استعمال نہیں کریں گے کیونکہ خون کے جھینٹے کپڑوں پر بڑھ جاتے ہیں۔
 اُس نے یہ طریقہ بہتر سمجھا کہ وہ گزبھرتی ساتھ لے گیا۔ داسے کو اُس نے
 بتایا تھا کہ ساڈھو سویا ہوا ملا تو ہاتھوں سے اُس کا گلا گھونٹ دیں گے۔ اگر
 جاگتا ملا تو اُس کے معتقد بن کر بیٹھ جائیں گے اور موقع دیکھ کر رستی گلی میں
 ڈال کر اُسے مار ڈالیں گے۔ انہوں نے شفاعت کے چیلوں کو سنبھالنے
 کا انتظام کر لیا تھا لیکن انہیں امید یہی تھی کہ وہ سوتے سوتے ہوتے ہوں
 گے۔ پریتو دن کے وقت تین بار شفاعت کے پاس گیا اور عقیدت
 کا اظہار کیا تھا۔ اُس نے معلوم کر لیا تھا کہ ساڈھو کس جگہ سوتا ہے۔

دونوں شفاعت کو قتل کرنے گئے۔ شفاعت جاگتا مل گیا اور اُس
 کے پاس کشوری بیٹھی ہوتی تھی۔ داسا بہت خوش ہوا کہ ایک ٹیٹ میں دو

مرے میں گئے لیکن شفاعت نے خنجر نکال لیا۔
 ”ہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ شخص خنجر چلانے میں اتنا تیز ہے۔“ داسا
 نے اپنا بیان دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ اتنی تیزی سے خنجر کو گھمانے لگا
 کہ ہم گھبرا کر پیچھے ہٹے اور گف سے نکل آئے۔ وہ ہمارے پیچھے آیا۔۔۔۔
 پریتو نے کہا کہ پکڑو اسے اور اسی خنجر سے ختم کرو۔ ہوا یہ کہ ساڈھو گھٹو کر
 کھا کر گر پڑا۔“

ان دونوں نے اُسے اُٹھنے نہ دیا۔ اُس سے خنجر چھین کر دو وار
 کئے۔ شفاعت اُٹھا تو پریتو نے آخری وار اُس کے پیٹ میں کیا اور خنجر
 وہیں چھوڑ کر دونوں بھاگ آئے۔ داسا نے بتایا کہ وہ اور پریتو نشتے میں
 تھے۔ نشتے کے علاوہ لالہ گھنیش اور سیٹھ بنارسی داس نے انہیں یقین
 دلایا تھا کہ اگر وہ پکڑے گئے تو انہیں بری کر لیا جائے گا۔ یہ دوسرا
 نشتہ تھا جو دونوں قاتلوں پر طاری رہا۔ یہی وجہ تھی کہ داسا بڑے مزے
 سے گھر میں سو رہا تھا۔

یہاں میں آپ کو ایک بات بتا دوں جو داسا اور پریتو کو معلوم
 نہیں تھی۔ شفاعت نے انہیں دیکھ کر خنجر جو چلایا تھا وہ اس لئے نہیں
 چلایا تھا کہ یہ دو آدمی اُسے قتل کرنے آئے ہیں۔ میں یہ رات اس لئے
 یقین سے دے رہا ہوں کہ مجھے شفاعت کی ذہنی حالت معلوم تھی۔ کشوری
 نے مجھے بتایا تھا کہ ساڈھو نے خنجر گھماتے ہوئے کہا تھا کہ اب تم انسانوں
 کے روپ میں آتے ہو۔ وہ انہیں جن بھوت سمجھ رہا تھا۔ اُس پر وہ دورہ
 پڑ گیا تھا جسے آپ کا لے جادو کا الٹا اثر کہہ سکتے ہیں، منمیر کا رد عمل کہہ
 سکتے ہیں اور اسے آپ شکوری کی آہوں کا اور اللہ کے کلام کا اثر بھی
 کہہ سکتے ہیں۔

میں پریتو کا بیان لینے لگا۔ اُس نے بیان کے دوران تین چار مرتبہ کہا۔ ”آپ بیان لے لیں۔ میں کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا۔ لالہ اور سیٹھ جیہیں چھڑالیں گے۔ میں آپ کا حکم مان رہا ہوں۔ آپ کو ناراض نہیں کروں گا۔“ میں نے بھی اسی خواہش کا اظہار کیا کہ وہ بری ہو جائے اور یہ بھی کہا کہ میں مقدمہ بڑا ڈھیل بناؤں گا۔ تم بری ہو جاؤ گے۔ تم نے کسی بیگناہ آدمی کو قتل نہیں کیا۔

پریتو داسا کی طرح کم عقل آدمی تھا۔ اس سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ اس کا بیان بہت لمبا تھا۔ اس دوران مجھے اطلاع ملی کہ ممتاز کی ماں، باپ اور بھائی آگئے ہیں۔ میں نے کہا کہ انہیں باہر زمین پر بٹھا دو۔ سورج غروب ہونے تک وہ باہر زمین پر بیٹھے رہے۔ میں نے کانٹیل سے کہا کہ انہیں کہو کہ چلے جائیں اور انہیں میرے پاس نہ آنے دینا۔

پریتو کا بیان ہو چکا تھا اور اُسے حالات میں بند کر دیا گیا تھا۔ کشوری اور اُس کے باپ کو میں نے خوب کھلایا پلایا تھا۔ کشوری کو میں نے کچھ باتیں بتائیں اور اُس کے باپ سے کہا کہ وہ کشوری پر کوئی شک نہ کرے۔ یہ بے چاری بیوہ ہے۔ اپنے من کی شانتی کے لئے ساڈھو کے ہاں چلی گئی تھی مگر وہاں کوئی اور ہی واقعہ ہو گیا۔ باپ خوش ہو گیا کہ اُس کی بیٹی پر کوئی الزام نہیں۔ میں دراصل کشوری کو خوش کرنا چاہتا تھا کیونکہ اُسے میں نے گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کرنا تھا۔ دونوں کو میں نے گاؤں بھیج دیا۔

شفاعت کے قتل کے جرم میں لالہ گھنیش چند اور سیٹھ بنارس داس بھی شامل تھے لیکن اُن کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا کسی کے ذہانی کہہ دینے سے کہ یہ قتل فلاں کے کہنے پر کیا گیا، اُسے گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے توقع تھی کہ یہ دونوں سرکردہ ہندو میرے پاس آئیں گے اور ہو سکتا ہے رشوت پیش کریں کہ داسا اور پریتو کو چھوڑ دوں، لیکن

عورت جال میں آگئی

صبح تک داسا کا بیان ختم نہیں ہوا تھا۔ میں جرح بھی کرتا جا رہا تھا۔ مجھے تو ذرا ذرا سی تفصیل کی ضرورت تھی کیونکہ مجھے مقدمہ قائم کرنا تھا۔ یہ اطلاع مجھے دو گھنٹے پہلے مل گئی تھی کہ پریتو کو گھر سے گرفتار کر لیا گیا اور اُسے حوالات میں بند کر دیا گیا ہے۔

داسا سے فارغ ہو کر میں نے پریتو کو حوالات سے نکلوا کر اپنے پاس بٹھایا اور اُسے کہا کہ داسا بیان دے چکا ہے۔

”تم بیان نہیں دو گے تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ میں نے کہا۔ ”موقعہ کے گواہ موجود ہیں اور تمہارے سامنے اقبال کی بیان بھی مل گیا ہے۔ میں نہیں سزا دے موت دلاؤں گا۔ اگر بیان دے دو گے تو تمہیں مرنے سے بچا لوں گا اور ہو سکتا ہے تم اپیل میں بری ہو جاؤ۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ اقبال کی بیان نہیں دو گے تو یہاں تمہاری حالت زندہ لاش جیسی کر دوں گا۔“

پریتو بھی کچا آدمی نکلا۔ وہ پہلی بار کپڑا گیا تھا۔ پولیس کے ساتھ اُس کا واسطہ کبھی نہیں پڑا تھا۔ تھوڑی سی پس و پیش کے بعد وہ مان گیا اور اُس نے اقبال کی بیان دے دیا۔ یہ داسا کے بیان کی تائید تھی۔ بہت ہی معمولی سا فرق تھا۔

پریتو کا بیان شروع ہونے سے پہلے میں نے ایک کام کیا۔ میں ممتاز کے قتل کی بھی تفتیش ساتھ ساتھ چلا رہا تھا۔ میں نے ایک کانٹیل کو ممتاز کے گاؤں بھیجا کہ وہ ممتاز کی ماں اور دونوں بھائیوں کو ساتھ لے آئے۔

وہ نہ آتے۔

میں نے دوسرے دن صبح صبح ایک کانٹیل کو بھیجا کہ ممتاز کی ماں وغیرہ کو ساتھ لے آئے۔ میں انہیں پریشان کر رہا تھا۔ اے۔ ایس۔ آتی سے کہا کہ وہ داسا اور پریٹو کو مجسٹریٹ کے پاس لے جا کر ان کے قبالی بیان قلمبند کرالے۔ اس کے بعد دونوں ملزموں کو جیل کی حوالات میں چلے جانا تھا۔

ممتاز کی ماں اپنے بیٹوں اور خاوند کے ساتھ آتی تو میں نے انہیں باہر بٹھا دیا اور دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ میں نے آپ کو پہلے بتایا ہے کہ ممتاز کا کاؤں دوسرے مٹانے میں تھا۔ اس کے انچارج سب انسپکٹر معین الدین نے کہا تھا کہ وہ مجھے بہت اچھے منجر دے گا۔ اُس نے اپنا یہ وعدہ پورا کر دیا تھا۔ اُس کے دو منجروں نے ممتاز اور اُس کے خاندان کے متعلق بڑے کام کی باتیں بتاتی تھیں جن سے ممتاز کے بھائیوں پر میرا شک بستہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ان کی ماں کو بار بار مٹانے بلایا کہ دراصل میں اُس کے بھائیوں کو پریشان کر رہا تھا۔

شام ہونے کو آتی لیکن میں نے ان لوگوں کو گاؤں چلے جانے کی اجازت نہ دی۔ سورج غروب کیا۔ اندھیہ (ہو گیا۔ میں اپنے گھر جانے لگا تو ممتاز کا بڑا بھائی میرے پاس آیا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ کہنے لگا کہ انہیں جانے کی اجازت کیوں نہیں دی جا رہی؟ میں نے کہا کہ وہ مشتبہ ہیں۔ میں انہیں جب تک چاہوں گا مٹانے میں رکھوں گا۔ میں گھر سے واپس آیا تو ممتاز کی ماں کو بلایا۔ اُس کی یہ حالت تھی کہ پاؤں پر کھڑی رہنے کے قابل نہیں تھی۔

”تم جس ساڈھو کے پاس جایا کرتی تھیں، وہ قتل ہو گیا ہے۔“ میں نے اُسے کہا۔ ”اور شک تمہارے بیٹوں پر کیا جا رہا ہے؟“ اُس کی حالت ایسی ہو گئی جیسے بے ہوش ہو جاتے گی۔

”جس روز تمہارے بیٹوں کو پتہ چل گیا کہ مشور کے ساتھ تمہارا لکھا تعلق تھا، اُس روز وہ مشور کو بھی قتل کر دیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے بیٹے پھانسی کے تختے پر پھڑسے ہیں۔ انہیں بچاؤ۔“ آپ اندازہ کریں۔ مکے میں کہ ایسی باتوں سے ایک ماں کی جذباتی حالت کیا ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ اس سے زیادہ بُری حالت اس ماں کی ہو گئی۔ اُس نے پہلے میری ہٹوڑی پکڑی پھر فرش پر بیٹھ کر میرے پاؤں پکڑ لئے۔ رورور کہنے لگی کہ میرے بیٹوں کی جگہ مجھے پھانسی دے دو۔ میں اپنی زمینیں بیچ کر ساری رقم آپ کے قدموں میں رکھ دوں گی۔ میں اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکالتا چلا گیا۔ اُسے اس کا بھی اچھا خاصا دھچکہ لگا تھا کہ میں نے اُس کے اور مشور کے تعلقات کا ذکر کر دیا تھا۔ وہ میرے آگے بھینتی چلی گئی۔

”میں ساڈھو کے قتل میں تمہارے بیٹوں کو نہیں پکڑوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”میں قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ کسی اور جرم میں تمہارے بیٹوں کو گرفتار نہیں کروں گا لیکن ممتاز کے قتل کے متعلق مجھے صحیح بات معلوم ہونی چاہیے ورنہ میں تمہارے بیٹوں کے لئے کچھ نہیں کر سکوں گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی بہن کو انہوں نے قتل کیا ہے۔ انہیں کہو مجھے بتادیں۔ میں انہیں بچا سکتا ہوں۔ لاش کی شناخت نہیں ہوتی۔ میرے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ وہ لاش تمہاری بیٹی کی تھی۔“

میں نے اس عورت کو ایک گھنٹہ چکر دیتے۔ ایک سے ایک دیکش فریب دیا۔ میں اُسے کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے بیٹوں سے کہے کہ وہ مجھے بتا دیں کہ انہوں نے اپنی بہن کو کس طرح قتل کیا ہے۔ اگر نہیں بتائیں گے تو میں انہیں گرفتار کر لوں گا اور انہیں ایسے طریقوں سے منوالوں گا کہ تم اپنے بیٹوں کو پہچان نہیں سکو گی۔ پھر وہ سیدھے پھانسی کے تختے پر یا عرقید کے لئے کالا پانی چلے جائیں گے خود بتا دیں گے تو میں انہیں صاف بچا لوں گا۔

دسے ڈالیں۔ چھوٹا بھائی بھی باہر نکل آیا۔ اُس نے ممتاز کو بڑی بیہودہ بات کہہ دی۔ ممتاز نے اُسے اس سے زیادہ بیہودہ بات کہہ دی۔ دونوں اُسے پکڑ کر اندر لے گئے۔ بڑے بھائی نے پیچھے سے اُس کا گلاباٹھوں میں دبایا۔ وہ مر گئی تو اُنہوں نے لاش گھوڑی پر ڈالی اور دوڑ جا کر دبا آئے۔ اُنہوں نے گڑھا کدال سے کھودا تھا۔

چھوٹے بھائی کو بلایا تو بڑے بھائی کے کہنے پر اُس نے بھی اقبال جرم کر لیا۔ رات آدھی گزر گئی تھی۔ میں نے ان کے ماں باپ سے کہا کہ وہ گاؤں چلے جائیں، اُن کے بیٹے صبح آجائیں گے۔ وہ چلے گئے اور میں نے دونوں بھائیوں کو حوالات میں بند کر دیا۔

دوسرے دن اُن کا اقبالی بیان قلم بند کرانے کے لئے مجسٹریٹ کے پاس بھیجا تو دونوں نے بیان دینے سے انکار کر دیا۔ مجسٹریٹ نے انہیں جیل کی حوالات میں بھیج دیا۔

میں نے دونوں کیس، ساڈھو کا قتل اور ممتاز کا قتل، اکٹھے تیار کئے۔ دونوں کیسوں کو ثابت کرنا بڑا مشکل تھا۔ ممتاز کے قتل میں اُس کے دونوں بھائیوں کو مجرم ثابت کرنا تو ناممکن نظر آ رہا تھا۔ میں نے جھوٹے گواہوں سے خالی خانے پُر کئے۔ یہ کام بڑا ہی نازک اور محال تھا لیکن میں نے کر لیا۔

اگر میں مٹانے لگوں کہ کیسے کیا تو اسی کی ایک کتاب بن جاتے گی۔

سیشن کورٹ نے ممتاز کے دونوں بھائیوں کو عمر قید کی سزا دی اور داسا اور پریٹو کو ساڈھو کے قتل میں سزائے موت دی۔ اُنہوں نے ہائی کورٹ میں اپیلیں دائر کیں۔ سب کی اپیلیں نامنظور ہو گئیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ لالہ گنیش چندا اور سیٹھ بنارس داس نے ساڈھو کو قتل کر لیا تھا لیکن وہ داسا اور پریٹو کی مدد کو نہ آئے۔ اُنہوں نے ہندو کی ذہنیت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

”کیا میں گے آپ کے“
”جو تم لوگ دو گے لے لوں“۔ اُس نے پوچھا۔
”جب تمہارے بیٹوں کو چھوڑ دوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”لوں گا اُس وقت دیکھاتی عورت جال میں آگتی۔“

ہندو نے ہندو کو دھوکہ دیا

”مجھے اُنہوں نے تین چار روز گزرے بتایا ہے کہ اُنہوں نے ممتاز کو قتل کر دیا تھا“۔ اُس نے کہا۔ ”اور وہ لاش اپنی گھوڑی پر ڈال کر وہاں دبا آتے تھے جہاں سے ملی تھی۔“

میں نے اس عورت کو تسلی دلا دے کہ باہر بھیج دیا اور اُس کے بڑے بیٹے کو بلایا۔ میں نے اُسے بلانے میں والنتہ کچھ وقت لگایا تھا تاکہ ماں اُسے اچھی طرح بتا دے کہ اُس نے مجھے راز دے دیا ہے اور سو داٹے ہو گیا ہے۔
”ماں نے تمہیں کچھ کہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں جی!“۔ اُس نے جواب دیا۔ ”ہم آپ کی بھولی بھریں گے۔“
”میں تمہاری کھال نہیں اُتار دوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”تجارت رقم لوں گا اور تمہارا کام کر دوں گا۔“

اُس نے بتایا کہ جس رات اُس کی ماں اور اُس کا باپ دوسرے گاؤں گئے ہوئے تھے، اُنہوں نے ممتاز سے کہا کہ وہ اپنا دماغ درست کر لے۔ ممتاز نے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سو گئے۔ چھوٹے بھائی کی ویسے ہی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے دیکھا کہ ممتاز لیٹر پر نہیں تھی۔ اُس نے بڑے بھائی کو جگایا۔ بڑا بھائی باہر نکلا۔ ممتاز آ رہی تھی۔ بڑے بھائی نے اُس سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آ رہی ہے؟ ممتاز نے کہا کہ دل گھبرا رہا تھا اس لئے باہر نکل گئی تھی۔

بڑے بھائی نے اُسے گالی دی۔ ممتاز نے ایک کی بجائے دو گالیاں

